محمد بن قاسم اور اس کے جانشین



مصنف: پروفیسر محمد اسلم

مجاہدِ کبیر

محمد بن قاسم

(علیہ الرحمۃ)

اور اس کے جانشین

مصنّف

پروفیسر محمد اسلم

سابق صدر شعبۂ تاریخ
پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

ریاض برادرز ، ۴۰ اُردو بازار ، لاہور

....

نام کتاب : "محمد بن قاسم اور اس کے جانشین"

ناشر : میاں نوید احمد حنفی

ریاض برادرز، 40 اردو بازار، لاہور

فون نمبر: 7224989

مطبع : ٹیکسیشن پریس ریٹی گن روڈ لاہور

سن اشاعت : 1996ء

تعداد اشاعت : 1100

قیمت : 112 روپے

انتساب

میں اپنی اس تحقیق و کاوش کو
اپنے بہت ہی قابلِ احترام بزرگ
نواب مخدوم سجاد حسین صاحب قریشی

زیبِ سجادہ درگاہ عالم پناہ
حضرت بہاء الدین ابو محمد زکریا ملتانی سہروردی

قدس سرہ العزیز

کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں۔

بگیر این ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

فہرست مضامین

صفحہ

حرفے چند

از قلم جناب پروفیسر شجاع احمد زیبا
سابق پرنسپل سراج الدولہ کالج کراچی

میں پروفیسر محمد اسلم صاحب کو ایک معتبر تاریخ دان کے طور پر جانتا تھا اور حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کے ارشاد پر ان کی ایک مایۂ ناز تصنیف خفتگانِ خاکِ لاہور کی تقریبِ رُونمائی میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کر چکا تھا، لیکن جب میں نے ان کی تازہ تصنیف "سفر نامۂ ہند" کا مطالعہ کیا تو مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ موصوف محض ایک مؤرخ ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہیں۔ مجلّہ سہ ماہی الزبیر بہاولپور میں ان کا ایک مضمون "کلامِ اقبال کی تاثیر موقع و محل کے اعتبار سے" پڑھ کر ان کے ادیب ہونے پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا۔

انہوں نے تاریخ کو اور خاص طور پر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے اسلامی دور کی تاریخ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ "محمد بن قاسم اور اس کے جانشین" سے قبل انہوں نے دینِ الہیٰ اور اس کا پس منظر، تاریخی مقالات، سرمایۂ عمر، سلاطینِ دہلی اور شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ موسیقی، رسالۂ صاحبیہ، طہماس نامہ، خفتگانِ کراچی، ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت، خفتگانِ خاکِ لاہور، تاریخِ اسلامی ہند، سفرنامۂ ہند، Muslim Conduct Of State، مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات اور خزانۂ جواہرِ جلالیہ جیسی معرکہ آراء کتابیں لکھ کر دادِ تحقیق دی ہے۔ اب انہوں نے محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں پر قلم اٹھایا ہے۔

فاضل مصنف نے اصل ماخذ سے تاریخ کا مطالعہ کرنے کی غرض سے عربی اور فارسی زبان میں انگلستان کی معروف یونیورسٹیوں سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں اور حق تو یہ ہے کہ عربی اور فارسی جانے بغیر تاریخ پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے اسلامی دور

کی تاریخ لکھنا، پڑھنا اور پڑھانا ممکن ہی نہیں ہے۔ جن ہندو اور انگریز مؤرخوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے انہوں نے بھی پہلے فارسی زبان کی تحصیل کی ہے۔

اسلم صاحب نے عربی ماخذ کی مدد سے محمد بن قاسمؒ کے بارے میں کئی نئے انکشافات کئے ہیں۔ لوگ عام طور پر محمد بن قاسمؒ کو حجاج بن یوسف کا بھتیجا اور داماد بتاتے ہیں لیکن ابنِ حزم نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف جمہرۃ الانساب میں اسے حجاج بن یوسف کے چچا کا پوتا بتایا ہے۔ ابنِ حزم نے یہ بھی لکھا ہے کہ حجاج کی کوئی بیٹی نہ تھی، اس سے اس کے داماد ہونے کا مفروضہ بھی پا در ہوا ثابت ہوا۔ اسی طرح اسلم صاحب نے پرمل دیوی اور سورج دیوی کی محمد بن قاسم پر بہتان تراشی کا جن دنداں شکن دلائل کے ساتھ رد کیا ہے، یہ انہی کا حصہ ہے۔ اسلم صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ حجاج بن یوسف سے عراقیوں کو تو شکایت ہو سکتی ہے لیکن ہمارے لئے تو اس کا وجود باعثِ برکت تھا۔ یہ حجاج ہی تھا جس نے سندھ کی مہم کا اہتمام کیا اور اس صوبے کو باب الاسلام بنا دیا۔

مؤرخین عام طور پر یہ کرتے ہیں کہ محمد بن قاسمؒ کو گرفتار کرا کے عراق روانہ کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی تاریخِ سندھ کا باب ختم کر کے سبکتگین اور محمود غزنوی کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ سندھ میں مسلمانوں کی تین سو سالہ تاریخ کو گول کر جاتے ہیں، حالانکہ انہی تین صدیوں میں سندھ میں اسلامی تہذیب پروان چڑھی اور سندھ اور عراق و شام کے درمیان مذہبی، ثقافتی اور تجارتی روابط قائم ہوئے۔

پروفیسر محمد اسلم صاحب نے جس عرق ریزی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اس کی داد نہ دینا نا انصافی ہو گی۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور عام قارئین کے لئے یکساں فائدہ مند ہو گی۔

میں آخر میں اس کتاب کے ناشر میاں نوید احمد حنفی کو بھی ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ ان کی سعی و کاوش سے اسلم صاحب کی محنت منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔

میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سعید بدر

کا درجہ دینا چاہتے ہیں ۔ میتھیو آرنلڈ کی رائے ہے کہ :

" کذب و افترا کے عظیم کہسار کا نام تاریخ ہے "

یا پھر بقولِ حالی :

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

یہ نقطۂ نظر بھی ہے جس کے مطابق تاریخ رُوداد واقعات ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ ان " اشیاء " کا مجموعہ بن جاتی ہے جن کی داستان صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی جاتی ہے ۔

تاریخ تو ان واقعات کی رُوداد ہوتی ہے نہ کہ واقعات ۔ پروفیسر رابنسن کے الفاظ میں تاریخ اسے کہتے ہیں کہ :

" جب ہم ہر اس چیز کو جانتے ہوں جو کبھی انسان نے کی ہو ، یا سوچی ہو ، یا کوئی امید قائم کی ہو یا اسے محسوس کیا ہو " ۔

میٹلینڈ کی بھی بعینہٖ یہی رائے ہے ۔ وہ کہتا ہے :

" تاریخ وہ علم ہے ۔ ۔ ۔ جس میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان نے کیا کچھ کیا ہے ، کیا کہا ہے اور کیا سوچا ہے ؟ "

جدید علمِ نفسیات کی روشنی میں تاریخ کو دیکھا جائے تو ہمیں تاریخ کو اس " تمام تر " کی روداد سمجھنا ہوگا جو انسانی دائرۂ دانش کی حدود میں رُونما اور واقع ہوئی ہو ۔ تاریخ کو ازمنۂ اولیٰ میں خاص طور پر ایک فنِ ادب کی شاخ تصوّر کیا جاتا رہا ۔ اٹھارہویں صدی کے نصفِ آخر میں اسے تین محققین نے ادب کا درجہ دیا ۔

ہیوم ، رابرٹ سن ، اور گبن

عصرِ حاضر میں تاریخ سے متعلّق خیالات اور تصوّرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور نظریات اس مقام کو چھوڑتے جا رہے ہیں جہاں تاریخ اپنی مثالی صورت میں فلسفے اور شاعری کا امتزاج سمجھی جاتی تھی ۔ دراصل عظیم ماہرِ تعلیم میکالے کی یہی رائے تھی کہ تاریخ شاعری اور فلسفہ کا حسین امتزاج ہے ۔ دورِ جدید میں تاریخ کو اہم ترین معاشرتی علم تسلیم کیا گیا ہے جس کا انسان کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے

کا درجہ دینا چاہتے ہیں ۔ میتھیو آرنلڈ کی رائے ہے کہ :

" کذب و افترا کے عظیم کہسار کا نام تاریخ ہے "

یا پھر بقولِ حالی :

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

یہ نقطۂ نظر بھی ہے جس کے مطابق تاریخ رُودادِ واقعات ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ ان " اشیاء " کا مجموعہ بن جاتی ہے جن کی داستان صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی جاتی ہے ۔

تاریخ تو ان واقعات کی رُوداد ہوتی ہے نہ کہ واقعات ۔ پروفیسر رابنسن کے الفاظ میں تاریخ اسے کہتے ہیں کہ :

" جب ہم ہر اس چیز کو جانتے ہوں جو کبھی انسان نے کی ہو ، یا سوچی ہو ، یا کوئی امید قائم کی ہو یا اسے محسوس کیا ہو " ۔

میٹلینڈ کی بھی بعینہٖ یہی رائے ہے ۔ وہ کہتا ہے :

" تاریخ وہ علم ہے ۔۔۔ جس میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان نے کیا کچھ کیا ہے ، کیا کہا ہے اور کیا سوچا ہے ؟ "

جدید علمِ نفسیات کی روشنی میں تاریخ کو دیکھا جائے تو ہمیں تاریخ کو اس " تمام تر " کی روداد سمجھنا ہو گا جو انسانی دائرۂ دانش کی حدود میں رُونما اور واقع ہوئی ہو ۔ تاریخ کو ازمنۂ اولیٰ میں خاص طور پر ایک فنِ ادب کی شاخ تصوّر کیا جاتا رہا ۔ اٹھارہویں صدی کے نصفِ آخر میں اسے تین محققین نے ادب کا درجہ دیا ۔

ہیوم ، رابرٹ سن ، اور گبن

عصرِ حاضر میں تاریخ سے متعلّق خیالات اور تصوّرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور نظریات اس مقام کو چھوڑتے جا رہے ہیں جہاں تاریخ اپنی مثالی صورت میں فلسفے اور شاعری کا امتزاج سمجھی جاتی تھی ۔ دراصل عظیم ماہرِ تعلیم میکالے کی یہی رائے تھی کہ تاریخ شاعری اور فلسفہ کا حسین امتزاج ہے ۔ دورِ جدید میں تاریخ کو اہم ترین معاشرتی علم تسلیم کیا گیا ہے جس کا انسان کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے

تاریخ کا لفظ یونانی زبان کے ایک ایسے لفظ سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنیٰ "بُننے" کے ہیں۔ "تاریخ" اور "بُننا" ہر دو نظریات کا باہمی تعلق اغلباً یونانی تاریخ دانوں کے ان احساسات کا مظہر ہے جن سے ان کے کام کی یہ نوعیت مراد ہوا کرتی تھی کہ وہ واقعات اور حالات کے چیدہ چیدہ تار ہائے نمایاں کو ایک پیکر کی صُورت میں بُن دیا کرتے تھے۔

جہاں تک انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کا تعلق ہے ماضی کے بیتے اور گذرے ہوئے واقعات اور ان واقعات سے باخبر ہونے کے لئے ایک جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ انگلش زبان میں لفظ History، فرانسیسی زبان میں Histoire اور جرمن زبان میں Geschischte سبھی ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہیں۔ یعنی انسان کا ماضی اور وہ علم جو انسان اپنے ماضی سے متعلق رکھتا ہے۔ پس لفظ "تاریخ" بیک وقت دو مطالب کا حامل ہے: ایک یہ کہ تاریخی واقعات سے متعلق ذخیرۂ معلومات کا نام ہے یا بذاتِ خود واقعات کا دوسرا نام ہے۔

عہدِ حاضر میں بالعموم تاریخ کے معانی کو قدرے وسیع تر تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ تاریخ میں وہ جملہ اُمُور شامل سمجھے جانے چاہئیں جو اس کا مواد بنتے ہیں یا فراہم کرتے ہیں یا بن سکتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ مطالب و معانی میں اس نوعیت کی توسیع کرنے میں بالعموم احتیاط برتی گئی ہے۔ تاہم عصرِ حاضر میں انہی مطالب اور معانی کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جب ہم کسی موقع پر تاریخِ انگلستان کا ذکر کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر ہم ادبی نگارشات کا حوالہ دیئے بغیر ہی ایسا کرتے ہیں اور اپنی بات کو مکمل سمجھتے ہیں۔ ہم بادشاہوں اور سیاست دانوں ہی کو تاریخ کا خالق تصوّر کرتے ہیں۔ ممتاز مؤرخ کارلائل نے کہا تھا:

"تاریخِ عالم فقط اکابرین کی سوانح ہے"

بعض اوقات ہم یہ بھی کہہ لیتے ہیں کہ مؤرخ صرف انہی واقعات کے سلسلے کو جوڑ جوڑ کر الفاظ کا لباس پہناتے ہیں جنہیں وہ خود تاریخ بنانا چاہتے ہیں یا تاریخ

کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ میتھیو آرنلڈ کی رائے ہے کہ:

"کذب و افترا کے عظیم کہسار کا نام تاریخ ہے"

یا پھر بقولِ حالی:

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

یہ نقطۂ نظر بھی ہے جس کے مطابق تاریخ رُوداد واقعات ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ ان "اشیاء" کا مجموعہ بن جاتی ہے جن کی داستان صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی جاتی ہے۔

تاریخ تو ان واقعات کی رُوداد ہوتی ہے نہ کہ واقعات۔ پروفیسر رابنسن کے الفاظ میں تاریخ اسے کہتے ہیں کہ:

"جب ہم ہر اس چیز کو جانتے ہوں جو کبھی انسان نے کی ہو، یا سوچی ہو، یا کوئی امید قائم کی ہو یا اسے محسوس کیا ہو"۔

میٹلینڈ کی بھی بعینہٖ یہی رائے ہے۔ وہ کہتا ہے:

"تاریخ وہ علم ہے ۔۔۔ جس میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان نے کیا کچھ کیا ہے، کیا کہا ہے اور کیا سوچا ہے؟"

جدید علمِ نفسیات کی روشنی میں تاریخ کو دیکھا جائے تو ہمیں تاریخ کو اس "تمام تر" کی روداد سمجھنا ہو گا جو انسانی دائرۂ دانش کی حدود میں رُونما اور واقع ہوئی ہو۔ تاریخ کو ازمنۂ اولیٰ میں خاص طور پر ایک فنِ ادب کی شاخ تصوّر کیا جاتا رہا۔ اٹھارہویں صدی کے نصفِ آخر میں اسے تین محققین نے ادب کا درجہ دیا۔

ہیوم، رابرٹ سن، اور گبن

عصرِ حاضر میں تاریخ سے متعلّق خیالات اور تصوّرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور نظریات اس مقام کو چھوڑتے جا رہے ہیں جہاں تاریخ اپنی مثالی صورت میں فلسفے اور شاعری کا امتزاج سمجھی جاتی تھی۔ دراصل عظیم ماہرِ تعلیم میکالے کی یہی رائے تھی کہ تاریخ شاعری اور فلسفہ کا حسین امتزاج ہے۔ دورِ جدید میں تاریخ کو اہم ترین معاشرتی علم تسلیم کیا گیا ہے جس کا انسان کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے

اور جو انسانیت کے گزشتہ نظریّات اور کُلّی اعمال کی تعمیر سے وابستہ ہے اور اب تاریخ "فن" سے زیادہ ایک مکمل علم کا درجہ رکھتی ہے اور عین مناسب کہ تاریخی ادب کی ترقی کو "فن" کی سطح سے "علم" کے بلند و بالا اور "مرتفع" مقام تک ترقی سمجھا جائے۔

وسیع تر تصوّر کے پیش نظر تاریخ وہ "سبھی کچھ" ہے جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ نہ صرف انسانی زندگی سے متعلّق بلکہ فطرت کے ہر پہلو پر جو کچھ بیتی ہے، تاریخ کہلاتی ہے۔ اس میں ہر وہ شے شامل ہے جس میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، جیسے کہ موجودہ سائنس اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ کوئی شے مکمل طور پر ساکن اور انقلاب کی زو سے محفوظ نہیں رہی:

شبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

(اقبالؒ)

اس لحاظ سے ساری کائنات اور اس کا ہر خورد و کلاں ہر چھوٹا و بڑا حصہ اپنی ایک "تاریخ" رکھتا ہے۔ صفحۂ دہر پر تاریخ کی روح ہر ہر شے میں بس رہی ہے۔ تصویرِ ہستی ایک ہِلتی جُلتی، رینگتی، بل کھاتی اور رنگ بدلتی کائنات کا عکس پیش کرتی ہے جہاں ایک نا تمام ارتقاء اور انقلاب کا چکر سا چل رہا ہے۔ کائنات کی اس دھوپ چھاؤں میں ہر بات جو وقوع پذیر ہوتی ہے، یا واقع ہوتی ہے، نظر آتی ہے، تاریخ کہلاتی ہے:

؎ زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

ابن خلدون فلسفہ تاریخ کا بانی ہونے کے اعتبار سے دنیا بھر کے مؤرخین میں بلند و ممتاز مقام کا حامل ہے۔ وہ پہلا مصنّف ہے جس نے تاریخ کو ایک خاص اور مستقل علم کا موضوع قرار دیا۔ تاریخی تحقیق و تنقید کے اصول قائم کیے۔ تمدّنِ انسانی کے مظاہر و کوائف پر گہری نظر ڈالی اور تاریخی واقعات کو علّت و معلول کے سلسلہ میں مربوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کی نظیر نہ تو ہمیں قدیم یونان اور روم میں ملتی ہے اور نہ قرونِ وسطیٰ کے عیسائیوں میں۔ خود عرب مصنّفین کے درمیان اس کے ہم پایہ تاریخ نگار موجود تھے لیکن بحیثیت ایک فلسفی مؤرخ کے کسی عہد یا ملک میں اس سے قبل اس

کا مثیل پیدا نہ ہوا۔ ممتاز محقق اور مؤرخ پروفیسر فلنٹ (FLINT) لکھتے ہیں کہ:

"فلسفۂ تاریخ میں افلاطون، ارسطو اور آگسٹائن تک اس کے ہم مرتبہ اور ہم پلّہ نہ تھے اور باقی مؤرخین اس لائق نہیں کہ ابن خلدون کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جائے"۔

ابن خلدون اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز کے لحاظ سے عرب مؤرخین کے درمیان اپنی نظیر آپ ہے۔ جس طرح فلسفۂ تاریخ میں اس کا کوئی پیش رَو نہ تھا اسی طرح مشرق میں اس کے بعد اس کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوا جو اس کے نقشِ قدم پر چلتا اور اس کے قائم کردہ فلسفہ کو ترقی دیتا۔ اس لحاظ سے اس کا صحیح اور حقیقی جانشین ویکو (VICO) ہے جو اس کے تین صدی بعد اطالیہ میں پیدا ہوا، جس کی تصنیف Sciqnza Nuova یعنی "علمِ جدید" سے یورپ میں فلسفۂ تاریخ کی بنیاد پڑی۔

ابن خلدون کے "مقدمہ" کے دنیا کی متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے جن میں اُردو، فارسی، ترکی، پرتگیزی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فرانسیسی ترجمہ موسیو دے نے کیا جس سے یورپ میں ابن خلدون کی دھاک بیٹھ گئی اور یورپ کو اعتراف کرنا پڑا کہ یقیناً ابن خلدون ہی فی الواقع پہلا شخص ہے جس کے دل و دماغ میں تاریخ کا فلسفیانہ تصوّر پیدا ہوا اور اس لحاظ سے وہی فلسفۂ تاریخ کا بانی بھی ہے۔

علمِ تاریخ اقصائے عالم کی تمام اقوام میں رائج و متداول ہے اور اس کی تحصیل و توسیع کے لئے لوگ وفورِ رغبت سے سیر و سفر کرتے رہتے ہیں۔ مشہور و معروف مؤرخ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ:

"نظر بہ ظاہر تاریخ اسلاف کے گُونا گُوں حالات اور قرونِ ماضی کے رنگا رنگ واقعات کے مجموعہ کا نام ہے جس میں ہر قسم کی باتیں، ہر قسم کی امثال و حکایات بیان کی جاتی ہیں اور اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہی تاریخ، حکمت کا سبق پڑھاتی، کائنات اور اس کے مبادی کی علتیں بتاتی، زمانے کے واقعات اور ان کے اسباب سے آگاہ کرتی ہے۔ اسی لئے فنون و حکمت میں اس کا بڑا مرتبہ ہے اور اس قابل ہے کہ علوم فلسفہ میں شمار ہو"۔

ابن خلدون نے ان مورّخین پر سخت تنقید کی ہے جو واقعات کا تجزیہ نہیں کرتے اور حقائق کو نظرانداز کرتے ہوئے غلط سلط واقعات بھی تاریخ میں شامل کر دیتے ہیں ۔ ان کے بقول :

"یہی وجہ ہے کہ موجودہ تاریخیں اکثر تحقیق سے خالی ہیں اور تنقیح کا کہیں پتہ نہیں چلتا" ۔ "لیکن حق ہمیشہ غالب رہتا ہے اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا"

ابن خلدون کی رائے میں مسلمان مؤرخین میں سے صرف چند لوگ ایسے ہیں جنہیں مؤرخین کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی رائے میں یہ تعداد تین چار سے زائد نہیں ۔ ابن خلدون اس سلسلہ میں ابنِ اسحٰق ، طبری ، ابن الکلبی، محمد بن عمر الواقدی ، سیف ابن العمر الاسدی اور مسعودی کے نام گنواتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جمہور سے ان کا رتبہ بالاتر ہے" ۔

ابن خلدون اپنے مقدمہ کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں :

"جاننا چاہیے کہ تاریخ بڑے مرتبہ کا علم ہے ۔ اس کے فائدے بہت ہیں اور غرض و غایت اچھی ۔ وہ اسلاف کے حالات ، اگلی اُمتوں کے اخلاق ، انبیاء کی سیرتیں ، سلاطین کی سیاست اور سلطنت کے طریقے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ اگر کوئی دینی و دنیوی معاملات میں ان میں سے کسی فریق کی پیروی کرنا چاہے تو باتم وجوہ کر سکے ۔ لیکن اس صورت میں بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ معلوماتِ عامہ اور متعدد ماخذ سے باخبر اور فکر صحیح و استقلال طبیعت رکھتا ہو جو اس کو حق و صواب تک پہنچائیں اور لغزش و اغلاط سے بچائیں کیونکہ اگر نقل و روایت پر ہی اعتبار کر لیا جائے اور اصولِ عادت ، قواعدِ سیاست تمدّن کی طبیعت انسان کی اجتماعی حالت کو حکم نہ بنایا جائے اور غائب کو حاضر اور حال کو ماضی پر قیاس نہ کیا جائے تو لغزش و غلطی کے علاوہ شاہراہ صدق و صواب سے دُور ہو جانے کا قوی احتمال ہے" ۔

چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ
داستانے قصۂ افسانۂ

این ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مردِ رہ کُند
روح را سرمایۂ تاب است این
جسم ملّت را چو اعصاب است این
ہمچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر رُوے جہانت می زند
وہ چہ سازِ جاں نگار دلپذیر
نغمہائے رفتہ در تارش اسیر
شعلۂ افسردہ در سوزش نگر
دوش در آغوش امروزش نگر
شمع اُو بخت اُمم را کوکب است
روشن از وے امشب و ہم دیشب است
چشم پُر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
بادۂ صد سالہ در مینائے او
مستئ پارینہ در صہبائے او
صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستان ما پرید
ضبط کن تاریخ را ، پایندہ شو
از نفسہاے رمیدہ زندہ شو
دوش را پیوند با امروز کن
زندگی را مرغ دست آموز کن
رشتۂ ایّام را آور بدست
ورنہ گردی روز کور و شب پرست
سر زند از ماضئ تو حال تو

خیزد از حالِ تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است
ے کشاں را شور قلقل زندگی است

مفکرِ اسلام، شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بھی تاریخ کی اہمیت پر "اسرار و رموز" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کے عروج و زوال میں "تاریخ" کیا کردار ادا کرتی ہے اور اہلِ بصیرت ماضی کے عروج و زوال کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کی تاریخ کو کیسے سنوار سکتے ہیں اور اسے روشن و تابناک کیسے بنا سکتے ہیں؟

آپؒ فرماتے ہیں:

"جب فرد کا رشتہ ماضی سے ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے ادراک کی کنگھی کے دندانے گر جاتے ہیں"۔ اسی طرح قوم بھی اپنی تاریخ سے روشنی حاصل کرتی ہے اور اپنی روایات کی یاد سے اس کے اندر خود شناسی پیدا ہوتی ہے۔ اگر تاریخ کی سرگزشت اس کی یاد سے محو ہو جائے تو وہ قوم نیستی میں گم ہو جاتی ہے۔ اے مرد عاقل! تیری زندگی کا یہ نسخہ ہے کہ تو اپنے گزشتہ واقعات کی شیرازہ بندی کرے"۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اے بے خبر انسان؟ کیا تو جانتا ہے کہ تاریخ ہے کیا؟
کیا یہ محض کسی قصے یا حکایت کا نام ہے، یا کوئی دلچسپ داستان ہے یا پھر کسی رنگین افسانے کو تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔ بلکہ تاریخ وہ چیز ہے جو تجھے اپنے آپ سے آگاہ کرتی ہے اور تجھے "مردِ کار" اور "مردِ راہ" بناتی ہے۔ تاریخ روح ملت کا سرمایہ اور اس کے بدن کے لئے بمنزلۂ اعصاب ہے۔ تاریخ تجھے سان پر خنجر کی طرح تیز کرتی ہے اور پھر دنیا کے مقابلے میں آزماتی ہے۔

واہ! تاریخ کیسا جاں افروز و دل پذیر ساز ہے جس کے تار میں گذشتہ نغمے اسیر ہوتے ہیں۔ اس کے سوز میں ماضی کے بجھے ہوئے شعلے دیکھ! اور اس کے آج میں گزشتہ کل کا انتظار کر۔ تاریخ کی شمع قوموں کے نصیب کا ستارہ ہے جس سے آج اور کل کی راتیں روشن ہوتی ہیں"۔

وہ ہوشیار آنکھ جو ماضی کو دیکھتی ہے، وہ تیرے سامنے اسے دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔ تاریخ کی صراحی میں ایسی سو سالہ پرانی شراب موجود ہے جس کے اندر ماضی کی مستی محفوظ ہے"۔

علامہ اقبالؒ تاریخ کی اہمیت مختلف دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور اپنی مثال کے لئے فطرت کو گواہ بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تاریخ وہ شکاری ہے جو اس پرندے کو اپنے دام میں لے آتی ہے جو ہمارے باغ سے اُڑ چکا ہے۔ تاریخ کو محفوظ کر کے پائندہ اور گزرے ہوئے سانسوں سے زندہ ہو جا! ماضی کا تعلق حال سے جوڑ اور زندگی کو اپنا پالتو پرندہ بنا لے۔ ایام کے رشتے کو اپنے ہاتھ میں مضبوط پکڑ! ورنہ تو دن کا اندھا اور رات کا پجاری بن کر رہ جائے گا۔ تیرا حال تیرے ماضی سے پیدا ہوتا ہے اور تیرا مستقبل تیرے حال سے۔ اگر تو حیات لازوال چاہتا ہے تو ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے قطع نہ کر۔ زندگی واقعات کے تسلسل کی موج کا نام ہے جیسے مے کشوں کے لئے شور قلقل"۔

علامہ اقبالؒ اُردو میں بھی فرماتے ہیں:

میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کی اکسیر ہے

ابن خلدون کے بعد مسلمانوں نے فن تاریخ کو بہت ترقی دی۔ اگرچہ ابن خلدون کا ہم پایہ وہم مرتبہ محقق اور مؤرخ تو پیدا نہ ہوا تاہم مسلمانوں نے مختلف بلادِ اسلامیہ کی تاریخیں لکھیں جس سے دنیا کے بہت بڑے خطّے کے حالات و واقعات قلمبند ہو گئے اور یہ خطّہ کم و بیش تین برِاعظموں تک محیط تھا۔ انڈونیشیا سے مراکش تک اور بلخ و بخارا و سمرقند سے سری لنکا تک، حتیٰ کہ افریقی ممالک کے بارے میں بھی

تاریخیں مرتب ہوئیں جن سے بعد میں اہل یورپ نے استفادہ کیا۔ ان نامور مؤرخین میں بلاذری، مقدسی، یعقوبی، ابن اثیر، سمعانی، یاقوت الحموی، اصطخری، ابن حوقل، سیّد سلیمان ندوی، شبلی نعمانی اور قاضی اطہر مبارک پوری شامل ہیں۔

عربستان و ہندوستان کے باہمی روابط زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔ ولادتِ مسیح سے تین ہزار برس قبل عرب اور سندھ کے درمیان تجارتی تعلقات کے شواہد ملتے ہیں۔ مؤرخین کے مطابق جنوبی عرب کا رسم الخط "مسند" کہلاتا ہے جو سندھ کے لفظ سے مشتق ہے۔ قرآن حکیم کی ۲۸ آیات میں بحری جہازوں کا ذکر ملتا ہے جو اس امر کی علامت ہے کہ عرب بحری سفر کیا کرتے تھے۔ بحرین کے دو قبائل بنو تمیم اور بنو عبدالقیس کے سراندیپ (موجودہ سری لنکا) سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ بنو تمیم کی ایک ذیلی شاخ بنو یربوع ہے اور اسی خاندان کی مظلوم لڑکی نے سندھی قزاقوں کے ہاتھوں گرفتاری پر بغداد کے گورنر حجاج بن یوسف کو امداد کے لئے پکارا تھا۔

عربستان اور ہندوستان کے تعلقات کا ثبوت اس امر سے بھی مل جاتا ہے کہ بہت سے ہندی الفاظ عربی زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ مثال کے طور پر بیڑے کو عربی میں بارجہ، چندن کو صندل، کپور کو کافور، کرن پھل کو قرنفل، پلپل کو فِلفل، نیلو پھل کو نیلوفر، جائے پھل کو جائیفل، تری پھل کو اطریفل، ناریل کو نارجیل کہتے ہیں۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق تین ہندی الفاظ قرآن حکیم میں موجود ہیں اور یہ الفاظ، مسک، کافور، اور زنجبیل ہیں۔ مزید براں "سُندس" نامی کپڑے کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے جو سندھ میں تیار ہوتا تھا اور عربوں میں مقبول تھا۔ ہندی تلواریں عربستان میں "مہند" کہلاتی تھیں۔ ایک مدح نگار نے جب تعریف کرتے ہوئے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو "السّیف من سُیُوفِ الھند" قرار دیا تو آپؐ نے اس کی تبدیلی یوں کی کہ مجھے السّیف من سیوفِ اللہ کہا جائے۔ گویا اس سے ہندی تلوار کا ذکر سامنے آتا ہے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ مبارک میں بحرین کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے سندھ اور گجرات پر حملے کئے تھے۔ ابن اثیر کے مطابق حکم بن عمرو تغلبی نے مکران فتح کیا اور ان کے ایک ساتھی نصیر بن ثور

بجلی نے بلوچستان کے وسیع خطّے پر قبضہ کر لیا۔ غرضکہ ہر مسلمان حکمران کے عہد میں سندھ اور بلوچستان کے علاقے میں مسلمانوں کے حملے جاری رہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ محمد بن قاسم کو ہی ہندوستان کے علاقہ سندھ میں اصل حملہ آور قابض حکمران تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس حملے کے اثرات بڑے دیرپا اور دُور رَس مرتب ہوئے۔ اس لئے تواریخ و سیر میں اسے اہمیت دی گئی۔

تحریکِ پاکستان کی جدّ و جُہد کے دوران میں بانئ پاکستان اعلیٰ حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے ایک بار فرمایا تھا:

"برِّعظیم میں پاکستان اسی وقت معرضِ وجود میں آگیا تھا جب محمد بن قاسم کے حملہ کے دوران پہلے سندھی نے کلمہ پڑھا تھا"۔

دراصل ہندوستان اور عربستان کے تعلّقات کے بارے میں مستند تاریخی مواد بہت کم ملتا ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ مختلف کتب تواریخ و سیر میں بکھرا ہوا ہے۔

پروفیسر محمد اسلم عہدِ حاضر کے بلند پایہ محقق اور تاریخ دان ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے سربراہ رہے ہیں۔ انہوں نے اکبر کا دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر، تاریخی مقالات، سرمایۂ عمر، سلاطینِ دہلی اور شاہانِ مغلیہ کا ذوق موسیقی، خفتگانِ کراچی، خفتگانِ خاکِ لاہور، تاریخِ اسلامی ہند، ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت، Muslim Conduct of State مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات، طہماس نامہ، رسالۂ صاحبیہ، تاریخِ دنیائے اسلام اور حال ہی میں سفر نامۂ ہند لکھ کر بہت شہرت حاصل کی ہے۔

ان کی تازہ ترین تصنیف "محمد بن قاسم اور اس کے جانشین" ہے جس میں انہوں نے بے حد محنت اور عرق ریزی سے عربی زبان کی کُتب سے تاریخی اوراق کو کھنگال کر ایسے انکشاف کئے ہیں کہ عقلِ انسانی حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔ انہوں نے پہلی بار عربی ماخذوں سے ثابت کیا ہے کہ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کا بھتیجا تھا اور نہ داماد، بلکہ وہ حجاج بن یوسف کے چچا کا پُوتا تھا۔

پروفیسر محمد اسلم فرماتے ہیں کہ "ابنِ حزم اُندلسی عربوں کے نسب کے

بڑے ماہر تھے۔ ان کے مطابق حجاج بن یوسف کی کوئی بیٹی ہی نہ تھی۔ اس لئے محمد بن قاسم کے حجاج کے داماد ہونے کی کہانی یکسر غلط اور من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس ہمیں آج تک تاریخی کتب میں یہی بتایا اور پڑھایا گیا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی محمد بن قاسم کا چچا اور سُسر تھا۔ ہمارے مؤرخین نے تحقیق کا بھاری پتھر اٹھائے بغیر اسے حجاج کا بھتیجا اور داماد قرار دیدیا اور وہی کچھ آج تک تاریخی اوراق میں درج کیا جا رہا ہے:

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ برِعظیم پاکستان و ہند اور بنگلہ دیش کے تمام مؤرخین محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ آور ہونے کے واقعات تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھتے اور لکھتے ہیں لیکن جونہی دمشق میں ولید بن عبدالملک کی بجائے اس کا چھوٹا بھائی سلیمان حکمران بنتا ہے تو وہ مرحوم حجاج بن یوسف کے رشتے داروں سے انتقام لیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر محمد بن قاسم کو بھی پابندِ سلاسل کر کے واسط بھیج دیا جاتا ہے۔ حیران کن امر ہے کہ محمد بن قاسم کی گرفتاری کے بعد ہمارے مؤرخین خاموش ہو جاتے ہیں اور تاریخِ سندھ کا باب ہی ختم کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ فوراً بعد امیرانِ غزنی کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جن میں امیر الپتگین، امیر سبکتگین اور محمود غزنوی کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سندھ میں مسلمانوں کے تین سو سالہ شاندار دورِ حکومت کو تاریخ کے اندھیروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ محمد بن قاسم کے چلے جانے کے بعد تاریخی فتوحات کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رہتا ہے حتیٰ کہ سندھ سے جس اسلامی حکومت کا آغاز ۷۱۲ء میں ہوا وہ پھیلتی ہی چلی گئی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملتان، بہاول پور اور موجودہ اوکاڑا تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین رہا۔ ملتان اور بہاولپور تو محمد بن قاسم ہی کے ہاتھوں پہلے ہی فتح ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ، بہاولپور اور ساہی وال کے علاقوں میں ارائیں قوم کی خاصی تعداد آباد ہے۔

یہ لوگ دراصل الزبیر الرائی اور سلیم الرائی کی اولاد ہیں جن کے قبیلہ کے ہزاروں لوگ محمد بن قاسم کی فوج میں شامل تھے اور یہ لوگ محمد بن قاسم کے

واپس چلے جانیکے بعد یہیں آباد ہو گئے ۔ محققین اور ماہر لسانیات کے مطابق لفظ " ارائیں عربی ، لفظ " الرّاعی " سے مشتق ہے ۔ عربستان میں بھیڑ بکریاں چرانے والے کو الراعی کہتے ہیں ۔ حضور رسالتمابؐ کی حدیث مبارک ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے " کہ تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور اپنی رعیت کے معاملے میں جوابدہ ہے " اسی طرح حکمران بھی راعی ہے اور جوابدہ ہے " گویا عربی میں راعی کا لفظ موجود ہے جس کا مطلب نگہبان ، رکھوالا اور چرواہا ہے " ۔

دراصل محمد بن قاسم کے حملہ سے شروع ہونے والی تین صدیاں بہت اہم ہیں ۔ ان ہی تین صدیوں میں شمالی مغربی ہند سمیت پوری دنیائے اسلام میں اسلامی تہذیب کی نشو و نما ہوئی اور سندھ اور عراق و شام کے درمیان دینی ، مذہبی ، ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم ہوئے جن کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

پروفیسر محمد اسلم ہر لحاظ سے داد و تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے تین صدیوں پر مشتمل اس دور کی تاریخ مرتب کرکے طرح نو ڈالی ہے :

؎ ما طرح نو افگندہ ایم کہ جدّت پسند افتادہ ایم

پروفیسر محمد اسلم نے آنے والے محققین کے لئے راہ کھول دی ہے ، اب ان کا کام ہے کہ وہ عربی ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کرکے اس طرح اسلامی دور کی تاریخ مرتب کریں جو ہمارا شاندار ورثہ ہے ۔

آخر میں پروفیسر محمد اسلم صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ چونکہ اس ضمن میں کام کر چکے ہیں لہذا انہیں چاہیے کہ تمام عربی ماخذوں اور ایرانی حوالوں کو یکجا کر دیں جن میں ہند یا سندھ کا ذکر آتا ہے ۔ خواہ یہ حوالے ، تجارت سے تعلق رکھتے ہوں بحری اسفار کے بارے میں ہوں یا جنگوں اور حملوں کی روداد سناتے ہیں ۔ ان سب کا یکجا کر دیا جانا قومی ضرورت ہے ۔ آج تک اس سلسلے میں کیا جانے والا کام نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ہمارے مورخین کا زورِ قلم اس بات پر صرف ہوتا رہا کہ شمال سے آنے والے حملہ آور کیوں کامیاب ہوئے اور پھر ان کی تفصیل بیان کی جاتی رہی ۔ ہمارے ہاں فارسی کا علم و ادب بھی آیا تو ایران کی بجائے توران کے حوالے سے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں آج بھی فارسی بولنے کا لہجہ تورانی ہے ، ایرانی نہیں ۔

آخر میں میاں نوید احمد حنفی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پروفیسر محمد اسلم صاحب کو ان کی تمام تر معروفیات کے باوجود اس موضوع پر لکھنے کے لئے مائل اور قائل کیا اور آخر کار ان سے تاریخِ سندھ کے بارے میں گرانقدر، معلومات افزا اور دلکش و عمدہ کتاب مرتب کرا لی ہے۔

توقع ہے کہ یہ کتاب اہلِ علم و دانش اور ہمارے طلباء و طالبات کے لئے مشعلِ راہ ہو گی اور اس کے مطالعہ سے ان کے لئے تحقیق اور جستجو کے نئے گوشے وا ہوں گے اور نئی راہیں کھلیں گی۔

خاکپائے درِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم

محمد سعید احمد بدر قادری

المعروف بہ

سعید بدر

۹ ر اپریل ۱۹۹۶ء

"البدر" 965 - نظام بلاک،

علّامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

عرضِ مُصنّف

محمد بن قاسم رحمۃ اللہ کی بّرِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں آمد ایک تاریخ ساز واقعہ ہے جس نے ان تینوں ملکوں کے باشندوں کی سیاسی ، مذہبی اور معاشرتی زندگی پر اَنمِٹ نقوش ثبت کئے ہیں ۔ خدا جانے ایشوری پرشاد اور اس جیسے متعصب ہندو مؤرخوں نے حقائق سے آنکھیں بند کر کے اسے کیونکر ایک معمولی سی " سرحدی جھڑپ " کا نام دے دیا جس کی ان کے ہاں کوئی خاص تاریخی اہمیت نہیں ہے ۔

محمد بن قاسم کی آمد کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جس سے صرف نظر کر لیا جائے ۔ یہ درست ہے کہ سندھ کی فتح مکمل ہوتے ہی محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا گیا لیکن اس کے ساتھ جو مسلمان عراق ، شام ، مسقط اور ایران سے سندھ آئے تھے وہ تو واپس نہیں چلے گئے تھے ۔ محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے سندھ کو اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دیبل ، منصورہ ، بُوقان ، قصدار ، ملتان اور بیلمان علم و فضل کے گہوارے بن گئے ۔ ان علمی مراکز میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے اہلِ فضل و کمال نے دیارِ عرب میں درس و تدریس شروع کر کے سندھ کا نام روشن کیا ۔ جب ایران و عرب میں اہلِ علم علمی محفلیں سجاتے تو وہ سندھ کے علماء و زہاد کا ذکر ضرور کرتے تھے ۔ عراق کے مشہور ادیب جاحظ کے دل میں سندھی علماء کی بڑی قدر تھی جس پر اس کی تصانیف دال ہیں ۔

محمد بن قاسم کی آمد کے بعد سندھ میں بڑے پیمانے پر اسلام کی نشر و اشاعت ہوئی ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے سندھی عمائدین کو خطوط ارسال کئے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ۔ ان کی مساعی جمیلہ سے بہت سے سندھی عمائدین مشرف باسلام ہوئے اور یوں سندھ " باب الاسلام " بن گیا ۔ سندھ کے متمول طبقے نے عربی زبان اپنا لی اور سندھی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی ۔ تاجروں اور پڑھے لکھے لوگوں نے عربوں جیسا لباس اختیار کر لیا ۔ عراق کا فنِ تعمیر سندھ

میں مقبول ہوا ۔ بہت سے سندھیوں نے عراق و شام میں سکونت اختیار کرلی اور اپنی گلیوں اور محلوں کے نام سندھ میں اپنی سابقہ گلیوں اور محلوں کے ناموں پر رکھے ۔ سندھ کے جاٹ عرب میں جا کر زُط کہلائے ۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے جدِّ امجد زوطی کا تعلق بھی انہیں سندھی جاٹوں کے ساتھ تھا جو سندھ کی سکونت ترک کرکے عراق میں جا بسے تھے ۔ سندھی باورچی اور ہندوستانی وید عراق میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے ۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ایک ہندوستانی وید کو اپنا ذاتی معالج مقرر کیا اور آیورویدک کی متعدد کتابوں کو عربی زبان کے قالب میں ڈھالا ۔

مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوؤں نے برِّعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش کی تاریخ کو محفوظ نہیں کیا ۔ راجہ داہر اور اس کے پیشرو حکمرانوں چچ اور ساہسی کی تاریخ بھی مسلمانوں کی سعی و کاوش سے محفوظ ہوئی ورنہ ہندوؤں کے ہاں اس عہد کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے ۔

ہمارے مؤرخین خصوصاً نصابی کتابیں لکھنے والے اہل قلم محمد بن قاسم کی گرفتاری کے ساتھ سندھ کی اسلامی تاریخ کا باب ختم کرکے سلطان سبکتگین اور محمود غزنوی کا ذکر شروع کر دیتے ہیں ۔ حالانکہ ان کے درمیان تین صدیوں کا بُعد ہے اور اس طویل عرصے میں سندھ میں مسلمانوں نے جو خدمات انجام دیں ان کے ذکر سے ہماری تاریخیں خاموش ہیں ۔ قاضی اطہر مبارکپوری مدظلہ العالی نے اس عہد پر بہت کچھ لکھا ہے اور مواد جمع کرکے ڈھیر لگا دیئے ہیں ۔ قاضی صاحب بنیادی طور پر عالمِ دین ہیں ، مؤرخ نہیں ۔ اس لئے انہوں نے تاریخ نویسی میں بھی " مولویانہ انداز " اختیار کیا ہے ۔ اس لئے ہمارے مؤرخین اور تاریخ کے طلبہ ان کی نگارشات سے کما حقہٗ استفادہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح " تاریخِ سندھ " لکھتے وقت سیّد ابُو ظفر ندوی مرحوم نے بھی محمد بن قاسم کے متعدد جانشینوں کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا حالانکہ انہیں عربی زبان پر دسترس تھی اور ان کے لئے مواد جمع کرنا بہت آسان تھا ۔ ان کی " تاریخِ سندھ " میں ندوی مؤرخین کی طرح پھیلاؤ بہت ہے لیکن عمق نہیں ہے ۔

اس دور کی تاریخ لکھنے کے لئے عربی زبان جاننی اشد ضروری ہے ۔ اس کے بغیر تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا ۔ یہ عربی مآخذ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ

23548

عام مؤرخین نے محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا بھتیجا اور داماد لکھ دیا ہے۔ اندلس کے سب سے بڑے عالم اور عربوں کے نسب کے ماہر ابنِ حزم نے جو شجرہ تیار کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کے چچا کا پوتا تھا، بھتیجا نہیں تھا۔ ابنِ حزم لکھتے ہیں کہ حجاج بن یوسف کے چار بیٹے تھے، بیٹی کوئی نہ تھی۔ اس لئے محمد بن قاسم کا داماد ہونا بھی صحیح نہیں ہے۔

سندھ میں گذشتہ چند سالوں سے ایک رَو چلی ہے اور سندھ کے "پڑھے لکھے" لوگ محمد بن قاسم کو "حملہ آور" سمجھنے لگے ہیں۔ میں نے ایک ایسے ہی سندھی فاضل سے، جو اپنے نام سے پہلے سیّد لکھتے تھے، پوچھا کہ وہ محمد بن قاسم سے کیوں ناخوش ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ We hate all invaders. میں نے عرض کیا کہ حضرت سیّد ہونے کے ناطے آپ بھی تو "حملہ آور" ہی ہیں۔ اس پر وہ ہنس کر خاموش ہو گئے۔

مجھ سے یہ تحقیقی کام جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان نے عربی کے اصل مآخذ سے کروایا اور دورانِ تصنیف مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ موصوف اس کتاب کو شائع کرانا چاہتے تھے لیکن اسی دوران میں وہ ریٹائر ہو گئے اور جو اہلِ علم ان کے جانشین ہوئے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اسلامی ہند کے بڑے بڑے بُت توڑنا چاہتے ہیں اور اب تک محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور خاص طور پر اورنگ زیب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ لہٰذا تاریخ نئے سرے سے ان کی مرضی کے مطابق لکھی جائے۔ میں ذہنی طور پر اسے قبول نہ کر سکا اور میں نے یہ کتاب کسی سرکاری ادارے سے شائع کروانے کی بجائے اس کا مسوّدہ اپنے دوست میاں نوید احمد حنفی کے حوالے کر دیا۔

کس نمی گوید کہ دوغِ من ترش است لیکن میں تاریخ کا طالب علم ہونے کی بِنا پر یہ ضرور کہوں گا کہ اُردو یا کسی دوسری زبان میں "سندھ میں عربوں کے دَورِ حکومت" پر اتنی مختصر اور جامع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ندوۃ المصنفین، لاہور
۲۴ دسمبر ۱۹۹۵ء

خادم الابرار
محمد اسلم

بنیادی مآخذ

بلاذری:

ابوالحسن احمد بن یحییٰ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کا مشہور مؤرخ، ماہرِ انساب اور جغرافیہ دان تھا۔ وہ بغداد میں پیدا ہوا اور اسی نواح میں اس کی زندگی گذری۔

اس نے اپنی تصنیف "فتوح البلدان" میں عربوں کے ہاتھوں مختلف ممالک کی فتح کے حالات بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ سیاسی حالات کے ضمن میں وہ ثقافتی اور معاشرتی حالات کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ بلاذری اختصار پسند مؤرخ تھا اس لئے وہ بے جا قصے کہانیاں بیان کرنے سے گریز کرتا ہے۔ مؤرخین نے فتوح البلدان کو تاریخی مصدر و مآخذ کی حیثیت سے بڑی اہمیت دی ہے اور سبھی نے بلاذری پر اعتماد کیا ہے۔ بلاذری کا انتقال ایک اندازے کے مطابق ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء میں ہوا۔

مقدسی:

ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن احمد المقدسی البشاری ۳۳۶ھ / ۹۴۶ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوا۔ بیس برس کی عمر میں وہ مکّہ مکرّمہ میں موجود تھا۔ جہاں اس نے مختلف ممالک سے حجِ بیت اللہ کے لئے آنے والے حاجیوں سے اہم تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل کیں۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور دیندار مسلمان تھا۔ اس کی تصنیف "احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم" عربی کے جغرافیائی لٹریچر میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے یہ کتاب ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں مکمل کی۔ اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدے، تحقیق اور مطالعہ سے بہت سی نادر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس نے ہر ملک کے شہروں تک پہنچنے کے راستوں، ان

ملکوں میں واقع دریاؤں، صحراؤں، جھیلوں، پہاڑوں، شہروں کی باہمی مسافتوں، شہروں کی خوبیوں، برائیوں، وہاں کے باشندوں کے فقہی مسالک، باہمی تعصبات اور لڑائی جھگڑوں، مختلف شہروں کی پیداوار، صنعتوں، درآمدات و برآمدات، اشیائے خور و نوش کے نرخوں، مروجہ سکوں، ناپ و تول کے پیمانوں، محصولات، حکمرانوں کی سیرت، باشندوں کی زبانوں، لہجوں، تہواروں، اخلاق، شکل و شباہت اور لباس کا ذکر بڑے احسن طریقے سے کیا ہے۔ اس کی تحریروں پر سبھی نے اعتماد کیا ہے۔ مقدسی کا انتقال اندازاً ۳۹۱ھ / ۱۰۰۰ء میں بیت المقدس میں ہوا۔ وہیں جبل زیتون کے دامن میں شہر کی جانب جانے والی سڑک کے کنارے اس کی آخری آرام گاہ ہے۔ راقم نے اس کی قبر جنوری ۱۹۶۷ء میں دیکھی تھی۔ اس پر ایک قبہ بنا ہوا ہے۔

یعقوبی:

تاریخ یعقوبی کا مصنف احمد بن ابو یعقوب بن جعفر بن واضح الکاتب العباسی ہے۔ وہ ایک نامور مؤرخ، جغرافیہ دان اور ماہرِ فلکیات تھا۔ نوجوانی میں وہ خراسان میں آلِ طاہر کی ملازمت میں رہا تھا اس لئے وہ خراسان اور سجستان کے حالات و اماکن سے کماحقہ واقف تھا۔ سجستان سے ملحقہ علاقوں مکران اور بلوچستان کی تاریخ پر بھی اسے دسترس تھی۔ اس کا اسلوبِ نگارش سادہ اور عام فہم ہے اور اس کی تاریخ افسانوں سے پاک ہے۔ وہ ہر عہد کے آغاز میں بروج و کواکب کا صحیح نقشہ بھی دیتا ہے جس سے اس کے ماہرِ فلکیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سرکاری محاصل کے بارے میں معلومات دی ہیں اور فوجی چھاؤنیوں کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس نے سندھ کے بارے میں بھی نادر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کی تاریخ ۲۵۹ھ / ۸۷۲ء پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا انتقال ۲۸۴ھ / ۸۹۷ء میں مصر میں ہوا۔ اس کا شمار قابلِ اعتماد مؤرخین میں ہوتا ہے۔

مسعودی:

ابوالحسن علی بن الحسین ایک باکمال مؤرخ اور جغرافیہ دان ہو گذرا ہے۔ وہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی اولاد سے تھا۔ وہ بغداد میں پیدا ہوا۔ بغداد

۔ اس زمانے میں عالم اسلام میں علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔ وہیں اس نے تعلیم و تربیت پائی ۔ اس کی طبیعت میں بڑا تجسس تھا اور اسی چیز نے اسے جوانی میں سیر و سیاحت پر مجبور کیا ۔ اس نے ۳۰۶ ھ / ۹۱۸ء میں سندھ اور گجرات کی سیاحت کی ۔ مسعودی نے سری لنکا، زنجبار، عمان، فلسطین، شام، مصر اور بحیرۂ خزر کے جنوبی ساحل کی جی بھر کر سیر کی ۔ ایک بار وہ تاجروں کے ایک گروہ کے ساتھ چین بھی گیا ۔ انہی اسفار کے دوران اس نے اسلامی ممالک کے بارے میں بیش بہاء معلومات حاصل کیں اور اپنے ذاتی مشاہدے سے بہت کچھ اخذ کیا ۔ یہی مشاہدہ اس کی تصنیف " مروج الذھب و معدن الجواہر " کا حاصل ہے ۔ اس نے سندھ اور گجرات کے بارے میں بعض ایسی نادر معلومات فراہم کی ہیں جو دوسری عربی تحریروں میں مفقود ہیں ۔ اس نے اپنے ہم عصر ہندو راجاؤں اور منصورہ و ملتان کے مسلمان حکمرانوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ۔ مسعودی نے ان کے نام، لقب، فوج کی تعداد، حدودِ قلمرو، ہمسایہ حکمرانوں سے تعلقات، پیداوار اور سکّوں سے متعلق نادر معلومات فراہم کی ہیں ۔

مسعودی نے ۳۳۶ ھ / ۹۴۷ء میں اپنی مشہور تصنیف " مروج الذھب و معدن الجواہر " قلمبند کی ۔ نو سال بعد اس نے اس پر نظر ثانی کی اور جہاں مناسب سمجھا نئے مآخذ کی روشنی میں ضمیمے لکھے ۔ آخری عمر میں اس نے اپنی جملہ تصانیف پر تبصرہ لکھا جو " التنبیہ و الاشراف " کے نام سے موسوم ہوا ۔ مسعودی کا انتقال ۳۴۶ ھ / ۹۵۷ء میں مصر کے شہر فسطاط میں ہوا ۔ مؤرخین نے اسے وسیع العلم اور قابلِ اعتماد مؤرخ تسلیم کیا ہے ۔

ابنِ اثیر:

عزالدین ابوالحسن علی بن محمد المعروف بہ ابنِ اثیر ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں عراق کے ایک قصبے جزیرہ میں پیدا ہوا ۔ اسی مناسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ الجزری لکھا کرتا تھا ۔ اس نے بغداد اور موصل میں تعلیم حاصل کی اور شام کی سیاحت کے دوران میں گراں قدر معلومات حاصل کیں ۔ وہ ایک مستند عالمِ دین اور قابلِ اعتماد مؤرخ تھا ۔ وہ ایک سفر کے دوران " وفیات الاعیان " کے مصنف ابنِ خلکان سے بھی ملا

اور اس کی سیرت و کردار سے بے حد متاثر ہوا۔

ابنِ اثیر نے " الکامل فی التاریخ " کے عنوان سے تاریخ کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ اس نے بھی مشہور مؤرخ طبری کی طرح سَن وار تاریخی واقعات نقل کئے ہیں۔ اس کی یہ تصنیف ۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء کے واقعات پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے " اُسد الغابہ فی معرفتہِ الصحابہ " کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس میں ۷۵۰۰ صحابہ کرامؓ کے حالات نقل کئے ہیں۔ یہ کتاب اس کی وسعتِ علم پر دال ہے۔

ابنِ اثیر نے " الکامل فی التاریخ " میں سندھ کے حالات بھی درج کئے ہیں جو سندھ میں عربوں کے دورِ حکومت کا ایک مستند مآخذ ہیں۔ ابنِ اثیر کا انتقال موصل میں ۶۳۰ھ / ۱۲۳۳ء میں ہوا۔

سمعانی:

عبدالکریم بن محمد چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں ایک مشہور ماہرِ انساب ہو گذرا ہے۔ وہ ۵۰۶ھ / ۱۱۱۲ء میں مرو میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے نامی گرامی علماء سے تعلیم پائی اور حدیث کی سماعت کی۔ اس نے " کتاب الانساب " کے عنوان سے ایک بڑی عمدہ اور معیاری کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں ولا، قبیلے، بطن، شہر، لقب، حرفہ یا جد کی جانب نسبت دیکھ کر کسی عالم کے حالات زندگی کا پتہ چل جاتا ہے۔ سندھ اور ملحقہ علاقوں کے مشہور شہروں دیبل، منصورہ، قصدار، بُوقان اور بیلمان میں رہنے والے علماء کے حالات پر یہ مستند کتاب ہے بلکہ بعض علماء کا ذکر صرف اسی کتاب میں ملتا ہے۔ " الانساب " ہمیشہ سے معتبر کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ سمعانی کا انتقال ۵۶۲ھ / ۱۱۶۷ء میں مرو میں ہوا۔

طبری:

ابنِ جریر طبری (م ۳۱۰ھ / ۹۲۳ء) ایک مستند مؤرخ ہے جس نے اپنے عہد تک کے سیاسی واقعات " تاریخ الرسل والملوک " کے عنوان سے قلمبند کئے ہیں۔ طبری نے وسطِ ایشیاء کی فتح پر بڑا زور دیا ہے لیکن فتح سندھ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

یاقوت الحموی:

ابُو عبداللہ شہاب الدین الرومی الملقب بہ یاقوت الحموی ۵۷۴ھ / ۱۱۷۸ء
میں بلادِ روم میں پیدا ہوا اور لڑکپن میں گرفتار ہو کر بغداد پہنچا جہاں ایک تاجر عسکر بن ابراہیم نے اسے خریدا۔ اس کے آقا نے اسے تعلیم دلائی اور حساب کتاب سکھلا کر تجارت میں لگایا۔ یاقوت نے تجارت کی غرض سے دُور دراز کے سفر کئے اور دورانِ سفر مختلف شہروں اور قصبوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

۵۹۶ھ / ۱۲۰۰ء میں اس کے آقا نے اسے آزاد کر دیا۔ حصولِ آزادی کے بعد یاقوت نے کتابت کا پیشہ اپنایا لیکن اس پیشے میں اس کا جی نہ لگا۔ اس کے قدیم آقا نے اسے ایک معقول رقم دے کر دوبارہ تجارت میں لگا دیا۔ یاقوت نے دوبارہ سفر شروع کیا اور مصر و شام کی سیاحت کی۔ اس نے خوارزم کا بھی دورہ کیا اور دو سال مرو میں قیام کر کے عبدالکریم سمعانی کے فرزند عبدالرحیم سے استفادہ کیا۔ یاقوت نے ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "معجم البلدان" مکمل کی۔ بظاہر اس کی شہرت جغرافیہ دان کی حیثیت سے ہے لیکن جب وہ کسی شہر کا ذکر کرتا ہے تو اس کی تاریخ اور وہاں کے اہلِ علم کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس سے اس کے کام کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

یاقوت نے ملتان، دیبل، قصدار، منصورہ، چیمور، سندان، کنہبائت، بُوقان اور بھڑوچ وغیرہ کے بارے میں نادر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس لئے سندھ اور گجرات کی تاریخ لکھتے وقت ہم "معجم البلدان" سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔

یاقوت کا انتقال ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء میں ہوا۔

اِصطخری:

ابُو اسحٰق ابراہیم بن محمد، ایران کے قدیم پایۂ تخت اِصطخر کا رہنے والا تھا۔
اس کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں بقیدِ حیات تھا۔ اس نے "المسالک والممالک" کے عنوان سے جغرافیے پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اصطخری نے جزیرۂ نما عرب، شام، مصر، فارس اور

ماوراء النہر کا سفر کیا اور جہاں وہ خود نہ جا سکا وہاں کے بارے میں سیّاحوں اور تاجروں سے معلومات فراہم کیں ۔ ۳۴۰ ھ / ۹۵۱ء میں وہ مشہور سیّاح ابنِ حوقل سے ملا اور اس کے مشاہدات سے استفادہ کیا ۔ مشہور مستشرق دخویہ کی تحقیق کے مطابق اصطخری کی تصنیف " المسالک و الممالک " مشہور جغرافیہ دان ابوُزید بلخی کی کتاب کا نیا رُوپ ہے ۔

اصطخری نے " المسالک و الممالک " میں سندھ اور گجرات کے شہروں کی سیاسی ، تمدّنی ، مذہبی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں جو اس علاقے کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں ۔

ابنِ حوقل :

ابوُالقاسم محمد النصیبی البغدادی ایک مشہور سیّاح اور جغرافیہ دان تھا ۔ وہ ۳۳۱ ھ / ۹۴۳ ء میں بغداد سے بغرضِ سیاحت نکلا اور متعدد اسلامی ملکوں میں گھوما ۔ دورانِ سفر اس نے جغرافیے کے موضوع پر ابنِ خرداذبہ ، الجیہانی اور قدامہ کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا ۔ دورانِ سفر ۳۴۰ ھ / ۹۵۱ء میں اس کی ملاقات اصطخری سے ہوئی ۔ ابنِ حوقل کا شروع میں یہ ارادہ تھا کہ وہ اصطخری کی تصنیف " المسالک و الممالک " میں ترمیم و تبدیلی کرے اور اس میں نقشوں کا اضافہ کرے ۔ بعد ازاں اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور اپنی سیّاحت اور جغرافیائی معلومات کو " صورۃ الارض " کے نام سے پیش کیا ۔ یہ کتاب ۳۶۷ ھ / ۹۷۷ء میں مکمل ہوئی ۔

ابنِ حوقل نے سندھ اور گجرات کے شہروں کے بارے میں بڑی نادر معلومات فراہم کی ہیں ۔ اس نے وہاں کے حکمرانوں ، تاجروں اور عوام کے اخلاق و اطوار لباس اور لین دین کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے ۔ ابنِ حوقل نے ان شہروں کی پیداوار ، صنعتوں اور وہاں رائج سکّوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں ۔ اس کی تحریروں پر مؤرخین نے اعتماد کا اظہار کیا ہے ۔

ابنِ حوقل اور اصطخری کے علاوہ ابنِ رُستہ صاحبِ " اعلاق النفیسہ " اور قزوینی صاحبِ " آثار البلاد و اخبار العباد " نے بھی سندھ کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے جس میں کوئی نئی بات نہیں ہے ۔

قاضی اطہر مبارکپوری:

ہمارے زمانے میں قاضی اطہر مبارکپوری نے سندھ میں عربوں کے دورِ حکومت پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ موصوف مبارکپور ضلع اعظم گڑھ، اُترپردیش، بھارت کے رہنے والے اور مستند عالم دین ہیں۔ وہ ایک مدت تک بمبئی سے ایک دینی رسالہ ـــ البلاغ ـــ نکالتے رہے ہیں۔ راقم کی ان کے ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ ان کی تصانیف میں سے، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، خلافتِ اُمویہ اور ہندوستان، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، الہند فی عہد العباسیین، رجال السند و الہند، اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، عرب و ہند عہدِ رسالت میں، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان اور ما وَرَدَ من الصحابۃ و التابعین فی السند و الھند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سندھ میں عربوں کے دورِ حکومت پر کام کرنے والا مصنف قاضی صاحب کی تصانیف سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

محمد بن قاسم

عرب و ہند کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات ازمنۂ قدیم سے چلے آتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں مسقط و عمان میں کھدائی کے دوران ماہرینِ آثار قدیمہ نے وہاں وادی سندھ کی تہذیب و ثقافت کے نمونے دریافت کیے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت سے تین ہزار سال قبل عرب اور سندھ کے درمیان تجارت ہوا کرتی تھی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جنوبی عرب کا قدیم رسم الخط "مسند" کہلاتا ہے جو "سندھ" سے مشتق ہے[1]۔ یمن میں ایسے کتبے ملے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی عرب سے بڑی تعداد میں لوگ تلاشِ معاش میں قلات چلے آئے تھے[2]۔

عبرانی، سریانی و عربی کے عالمِ بے بدل اور خطِ حمیری کے ماہر ابو الجلال ندوی مرحوم نے یمن کے ایک قدیم حمیری کتبے کو یوں پڑھا ہے:

"مظھت امام بن حاجل الم کی پہاڑیاں لے لو۔ زمانہ کے موجد نے فرمایا آگیا وقت سفر۔ خداوند خلاق کی اولاد بخشی سے زیادہ ہو گئی تعداد انسانوں کی۔ روانہ ہوں کمانے والے بڑے بڑے طرف جماعت **قلات** کے"۔

یمن کے لوگ دریاؤں اور ندیوں پر بند باندھنے کے ماہر تھے۔ انہوں نے یمن سے قلات آکر کئی بند تعمیر کیے۔ ان شکستہ بندوں کی تصویریں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بذیل مادہ "قلات" موجود ہیں۔

سیّد سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) تحریر فرماتے ہیں کہ عرب جزیرہ نما ہے اس لئے عربوں کے لئے جہاز رانی کے بڑے مواقع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ہمیشہ سے جہاز ران اور دریا پیما قوم رہے ہیں[3]۔ قرآن حکیم کی ۲۸ آیاتِ مبارکہ میں بحری جہازوں کا ذکر آیا ہے۔ اگر عرب اور خصوصاً قریش کو اس قسم کے بحری جہازوں کا عینی تجربہ نہ ہوتا تو پھر یہ مثالیں ان کے لئے کیا اثر پیدا کر سکتی تھیں؟ قاضی اطہر مبارکپوری رقمطراز ہیں کہ خلیج فارس کے ساحلی علاقے بحرین کے دو قبیلوں بنو تمیم اور بنو عبدالقیس کے سراندیپ (موجودہ سری لنکا) سے قدیم زمانے سے تجارتی تعلقات تھے اور ان قبیلوں کی وہاں آزادانہ آمد و رفت تھی اور ان کے کئی خاندان سراندیپ میں بس گئے تھے۔ بنو تمیم کی ایک ذیلی شاخ بنو یربوع ہے اور اسی خاندان کی مظلوم بچی نے سندھی قزاقوں کے ہاتھوں گرفتاری کے وقت حجاج بن یوسف کو مدد کے لئے پکارا تھا[4]۔

اُبلّہ شط العرب میں ایک قدیم بندر گاہ تھی ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں ایرانیوں کے ساتھ ایک جنگ یہیں لڑی گئی تھی ۔ اُبلّہ بحری تجارت کا بڑا مرکز تھا اور یہاں سندھ ، جنوبی ہند اور چین سے جہاز آیا کرتے تھے[۵] ایران کے ساحلی شہر سیراف کی بھی بڑی تجارتی اہمیت تھی اور وہاں دُور دُور سے تاجر سامانِ تجارت لے کر آیا کرتے تھے ۔ ظہورِ اسلام سے ہزاروں سال قبل عرب تاجر ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے تجارتی سامان لے کر شام و مصر کے راستے یورپ تک پہنچاتے اور وہاں کا سامان ہندوستان ، جزائر شرق الہند (موجودہ انڈونیشیا) چین اور جاپان تک لے جاتے تھے[۶]

عرب و ہند کے درمیان تجارتی تعلقات نے عرب کی زبان و ثقافت کو بھی متاثر کیا ۔ چنانچہ عربوں نے بہت سے ہندی الفاظ کو عربی قالب میں ڈھال کر اپنی روز مرّہ کی زبان میں شامل کر لیا ۔ مثلاً بارجہ (بیڑا) ، دونج (ڈونگی) ، جبرش ، کنبر ، ناخوذہ (ناؤخدا) ، صندل (چندن) ، تنبول (تامبول) ، کافور (کپور) ، قرنفل (کرن پھل) ، فلفل (پلپل) ، فوفل (کوبل) ، نیلوفر (نیلو پھل) ، ہیل (ایل) ، جائفل (جائے پھل) ، اطریفل (تری پھل) ، شخیرہ (شکھر) ، بلیلج (بہیڑا) ، ہلیلج (ہڑا) ، آملج (آملہ) ، بلادر (بھلاوہ) ، نیلج (نیل) ، قرمز (کرمج) ، شیت (چھینٹ) ، قرفس (کرپاس) اور نارجیل (ناریل) وغیرہ[۷] علامہ سیّد سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق قرآنِ حکیم میں تین ہندی الفاظ مسک ، کافور اور زنجبیل اب عربی مبین کی شکل میں موجود ہیں[۸] قرآن حکیم میں " سُندُس " نام کے کپڑے کا ذکر آیا ہے[۹] اس کے بارے میں جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ کپڑا سندھ میں تیار ہوتا تھا اور عرب ممالک میں بڑا مقبول تھا ۔ ہندی ساخت کی تلواروں کی عرب میں بڑی مانگ تھی اور ہند کی نسبت سے یہ " مُہنّد " کہلاتی تھیں ۔ اسی طرح ہند اور ہندہ عرب لڑکیوں میں بڑا مقبول نام تھا اور عہدِ رسالت میں کئی خواتین اس نام سے موسوم تھیں جن کا ذکر کتبِ سیرت اور احادیث میں ملتا ہے ۔ عربی زبان میں ہندی الفاظ کی اس کثرت کے ساتھ شمولیت دونوں ملکوں کے مابین تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔

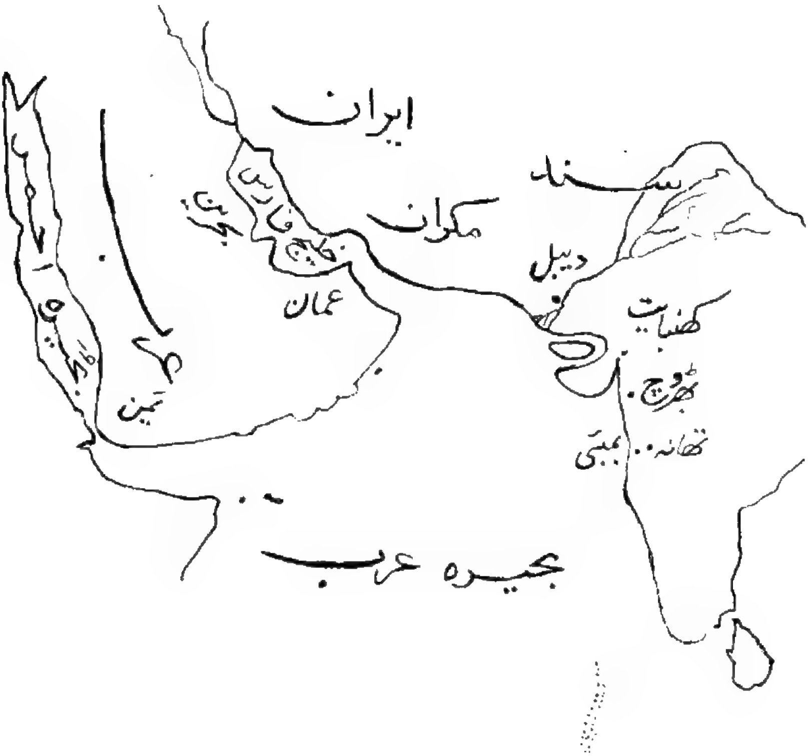
ہمارے زمانے میں بحرین خلیجِ فارس میں واقع ایک جزیرے کا نام ہے جو تیل کی دولت سے مالا مال ہے لیکن قرونِ اولیٰ میں خلیجِ فارس کا شمال مغربی علاقہ بحرین

کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے جنوب میں قطر اور شمال میں کویت تھا اور یہ علاقہ عربوں کے دو بڑے قبیلوں، بنو تمیم اور بنو عبدالقیس کا مسکن تھا جو بحری تجارت پر چھائے ہوئے تھے[۱]

حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵ ھ / ۶۳۶ء میں ایک تجربہ کار فوجی افسر اور صحابی حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ (م ۵۵ ھ / ۶۷۵ء) کو بحرین کا گورنر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ نے ایران کے خلاف عام فوجکشی کا حکم دیا اور ایرانی سرحد سے قریب بصرہ اور کوفہ کے نام سے دو بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ انہی ایام میں بحرین کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ نے ایران کی جانب سے ممکنہ بحری حملے کے تدارک کے لئے چند بحری جہاز تیار کرائے۔ انہوں نے خلیفہ سے اجازت لئے بغیر ہی اپنے ایک بھائی حکمؓ کو ایک بحری بیڑے کا امیر بنا کر ساحل گجرات کی جانب روانہ کیا اور دوسرے بھائی مغیرہؓ کو چند جہاز دے کر سندھ کی طرف بھیجا[۱] قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ رائے اپنی جگہ بڑا وزن رکھتی ہے کہ ان مہمات کا مقصد ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کرنا نہ تھا بلکہ سندھ اور ہند کے غیر مسلم حکمرانوں کو مسلمانوں کے خلاف ایران کی مدد کرنے سے روکنے کے لئے ایک تنبیہی اقدام تھا[۱]

حضرت حکمؓ (م ۴۵ ھ / ۶۶۵ء) نے موجودہ بمبئی سے قریب اس زمانے کے مشہور تجارتی مرکز تھانہ پر حملہ کیا۔ تھانہ بمبئی سے ۳۴ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک کھاڑی کے کنارے واقع ہے جو بحیرۂ عرب سے ملی ہوئی ہے۔ راقم نے ۱۹۶۹ء میں بمبئی کے سفر میں اس جگہ کا معاینہ کیا جہاں حضرت حکمؓ نے حملہ کیا تھا۔ یہاں مسلمانوں کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی اور وہ بہت سا مالِ غنیمت لے کر خلیج کھنبایت کی جانب بڑھے۔ ان مجاہدین کا دوسرا ہدف بھروچ تھا جو بمبئی سے جانبِ شمال ۳۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے نربدا کے کنارے ساحلِ سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع ہے[۱]۔ یہاں بھی کامیابی نے مجاہدین کے قدم چومے۔ راقم نے یہ دونوں جگہیں دیکھی ہیں۔ یہ ساحل سمندر سے ذرا ہٹ کر دریاؤں کے کنارے واقع ہیں۔ حضرت حکمؓ سمندر سے اپنے جہاز دریا کے راستے ان مقامات تک لے گئے اور انہیں بآسانی فتح کر لیا۔

حضرت حکمؓ کی طرح ان کے بھائی مغیرہؓ نے بھی سندھ کے کسی ساحلی


ایران
سند
مکران
خلیج فارس
بحرین
عمان
یمن
دیبل
کھنبایت
بھروچ
تھانہ
بمبئی
بحیرہ عرب

مقام پر حملہ کرنے کی بجائے دیبل کا رخ کیا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں اس کی ایک بڑی شاخ کا انتخاب کیا۔ مغیرہؓ نے دیبل کی بندرگاہ میں کھلبلی مچا دی اور بہت سا مالِ غنیمت لے کر بحرین واپس پہنچ گئے[14] حضرت حکمؓ اور مغیرہؓ کی ان مہمات کے بعد سندھ اور ہندوستان کے کسی حکمران کو مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں ایران کی مدد کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

حضرت عمر فاروقؓ ابھی تک گجرات و سندھ کی بحری مہمات سے مطلق بے خبر تھے۔ انہوں نے عراق کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے سندھ، کرمان اور عراق کے حالات دریافت کئے تو انہوں نے حضرت حکمؓ اور مغیرہؓ کی کامیاب مہموں کے بارے میں انہیں مطلع کیا۔ مسلمانوں کو چونکہ ابھی تک بحری جنگوں کا تجربہ نہ تھا اور پھر اتنا غیر ذمہ دارانہ قدم خلیفہ کی اجازت کے بغیر اٹھایا گیا تھا، اس لئے اتنا بڑا خطرہ مول لینے کے لئے حضرت عمر فاروقؓ بحرین کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ سے بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے ان کے نام بڑا سخت خط لکھا جس میں یہ مرقوم تھا:

"اے ثقیف کے بھائی! تم نے کیڑوں کو لکڑی پر سوار کرا کے سمندری خطروں میں ڈالا۔ بخدا اگر مسلمان تباہ ہو جاتے تو میں اتنی ہی تعداد میں تمہارے قبیلے کے افراد کو پکڑ لیتا"[15]

خلیفۃ المسلمین کی اس تنبیہ کے بعد بحری مہمات کا سلسلہ یک دم رک گیا اور مسلمانوں کی تمام تر توجہ برّی مہمات کی جانب مبذول ہو گئی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے آخری دورِ حکومت میں ۲۳ھ / ۶۴۴ء میں حکم بن عمرو تغلبی نے مکران کی جانب پیشقدمی کی[16] ابنِ اثیر لکھتا ہے کہ اس موقع پر سندھ کے حکمران نے اہلِ مکران کی مدد کی تھی[17] تاہم حکم نے مکران فتح کر لیا اور ان کے ایک ساتھی نسیر بن ثور عجلی نے بلوچستان کے ایک وسیع خطّے پر قبضہ کر لیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے جانشین حضرت عثمان غنیؓ بھی سندھ میں دلچسپی لیتے تھے[18] ان کے دورِ خلافت میں عبداللہ بن عامر ایک نامور فوجی افسر تھے اور وہ مکران اور قندابیل میں مقیم تھے۔ ان دنوں قندابیل بلوچستان کا ایک اہم شہر تھا اور آج کل اسے گنڈاوہ کہتے ہیں اور یہ آج کل ایک ضلع کا صدر مقام اور مگسی قبیلے کا مسکن ہے۔ حضرت

عثمان غنیؓ نے عبداللہ کو لکھا کہ وہ سندھ کے حالات سے انہیں مطلع کرے ۔ عبداللہ نے حکیم بن جبلہ العبدی کو اس کام پر مامور کیا اور اس نے مکران کے ساتھ ملنے والے سندھ کے سرحدی علاقے کا سروے کرنے کے بعد ایک رپورٹ تیار کی ۔ عبداللہ نے اس سے کہا کہ وہ خود ہی یہ رپورٹ امیر المومنین کی خدمت میں پیش کرے ۔ حکیم بن جبلہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ بہت باتونی تھا اور جب وہ حضرت عثمان غنیؓ کی خدمت میں باریاب ہوا تو اس نے سندھ کے بارے میں یہ رپورٹ پیش کی :

ماءھا وشل و ثمرھا دقل وارضھا جبل و اھلھا بطل ان قل الجیش بھا ضاعوا و ان کثروا جاعوا ۔[19]

ترجمہ : وہاں پانی خراب ہے اور پھل نکمے ہیں ۔ وہاں کی زمین سنگلاخ ہے اور باشندے دلیر ہیں ۔ اگر وہاں چھوٹا لشکر بھیجا جائے تو وہ ضائع ہو جائے گا اور اگر بڑا لشکر جائے گا تو بھوکوں مر جائے گا ۔

اس پر حضرت عثمان غنیؓ نے حکیم بن جبلہ کو مخاطب کرکے فرمایا : " تم رپورٹ پیش کر رہے ہو یا سجع کہہ رہے ہو " ۔ اس نے کہا کہ وہ رپورٹ پیش کر رہا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس سے یہ سوال بھی کیا کہ وہاں کے باشندے وفادار ہیں یا جفا پیشہ ؟ حکیم نے کہا کہ وہ خائن اور غدار ہیں ۔ اس کی رپورٹ سن کر حضرت عثمان غنیؓ نے سندھ پر فوجکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی پوری توجہ سندھ کی سرحد پر واقع قندابیل کی فوجی چھاؤنی کو مضبوط بنانے پر مبذول کر دی ۔

حضرت عثمان غنیؓ کے جانشین حضرت علی المرتضیٰؓ بھی سندھ کے حالات سے بے خبر نہ تھے ۔ ان کی طرف سے ایک عرب سردار سندھ کے حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا ۔ ان کے عہدِ خلافت میں ان کے ایک فوجی سردار تاغر بن زعر نے کیکان (موجودہ قلات) کی جانب پیشقدمی کی[20] ۔ کیکان کے حاکم نے اس کا مقابلہ کیا لیکن منہ کی کھائی ۔ اس موقع پر چند غیر مسلموں نے اسلام قبول کر لیا اور تاغر مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلے آئے[21] اس کے بعد ملک کے داخلی مسائل نے حضرت علی المرتضیٰؓ کو سندھ کی جانب توجہ دینے کی مہلت نہ دی ۔

حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں دوبارہ فتوحات کا دَور دَورہ شروع

ہوا ۔ انہوں نے عبداللہ بن سوار العبدی کو چار ہزار سواروں کا کمانڈر بنا کر سندھ کی طرف روانہ کیا اور چلتے وقت انہیں یہ نصیحت کی کہ وہ کیکان کے غداروں سے خبردار رہیں[۲۲]۔ وہ بڑا سخی تھا اور لشکریوں کو اپنے دسترخوان پر کھانا کھلایا کرتا تھا ۔ عبداللہ کی کیکان کے نواح میں دشمنوں کے ساتھ ایک خونریز جھڑپ ہو گئی جس میں مسلمانوں کا بڑا جانی نقصان ہوا ۔ امیرِ لشکر عبداللہ میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور ہزیمت خوردہ فوج مکران روانہ ہو گئی[۲۳]۔

عبداللہ بن سوار کی شہادت اور مسلمانوں کی شکست سے خلافت کے وقار کو بڑا دھچکا لگا ۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کی تلافی کے لئے سنان بن سلمہ الہذلی کو کیکان روانہ کیا اور عراق کے گورنر عبداللہ بن زیاد کو حکم دیا کہ وہ کسی قابل شخص کو سندھ کی سرحد پر مامور کرے ۔ خلیفہ کا حکم ملتے ہی عبداللہ نے احنف بن قیس جیسے تجربہ کار فوجی سردار کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ دو سال تک سندھ کی سرحد پر کڑی نظر رکھیں[۲۴]۔

اسی زمانے میں امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا اور اسے مشرقی علاقوں پر نظر رکھنے کا حکم دیا ۔ قریباً انہی ایام میں دربارِ خلافت سے عمر بن عبداللہ بن عمر فاروقؓ سندھ کی سرحد سے قریب ارمابیل (موجودہ بیلہ) کی فتح کے لئے نامزد ہوئے[۲۵]۔

سنان بن سلمہ الہذلی حضرت امیر معاویہؓ کے حکم سے کچھ عرصہ کیکان میں مقیم رہا پھر اس کی جگہ راشد بن عمرو جیسے شریف النفس اور باہمت فوجی افسر کا تقرر ہوا ۔ وہ ایک سال تک اس علاقے میں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد عراق روانہ ہوئے تو اثنائے سفر دشمنوں کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہو گئی اور وہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے[۲۶]۔

راشد بن عمرو کی جگہ دوبارہ سنان بن سلمہ الہذلی کا تقرر ہوا ۔ اس نے حالات پر قابو پانے کے فوراً بعد سندھ کی جانب پیش قدمی کی ۔ موجودہ ضلع دادو میں منچھر جھیل سے قریب بودھیہ کے علاقے میں وہ دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا ۔ اس کی شہادت کے بعد اس کی جگہ منذر بن جارود کا تقرر ہوا لیکن وہ جلد ہی بورالی کے نواح میں فوت ہو گیا ۔ منذر کی رحلت کے بعد اس کا بیٹا حکم کیکان کا گورنر مقرر ہوا[۲۷]۔

۴۱ھ / ۶۶۱ء میں مہلب بن ابو صفرہ ازدی سجستان کا گورنر مقرر ہوا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پاکستان، افغانستان اور ایران کی سرحدیں ملتی ہیں۔ مہلب نے فاتح کابل عبدالرحمٰن بن سمرہ کے ساتھ قرب و جوار کے علاقوں کی تسخیر میں حصہ لیا تھا اور وہ اس علاقے کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ جب وہ خود اس علاقے کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے فتوحات کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی [۲۸]

۴۴ھ / ۶۶۴ء میں مہلب نے بلوچستان کا مشہور شہر قندابیل (موجودہ گنڈاوہ) فتح کیا اور دوسری جانب اس نے کوہ سلیمان عبور کر کے بنہ (موجودہ بنوں) اور تربیلہ سے قریب ضلع صوابی کے مشہور قصبے لاہور (نزد تربیلہ ڈیم) پر کامیاب حملے کئے۔ مہلب کے ہاتھوں بنہ کی فتح کا ذکر عربی اشعار میں بھی ملتا ہے [۲۹]

ایک بار مہلب کی مڈبھیڑ ترکوں کے ایک فوجی دستے کے ساتھ ہو گئی۔ ان ترکوں کے گھوڑوں کی دُمیں کٹی ہوئی تھیں۔ مہلب کو ان کی یہ ہئیت پسند آگئی اور اس نے بھی اپنے گھوڑوں کی دُمیں قطع کروا دیں۔ یہیں سے عربوں میں گھوڑوں کی دُمیں قطع کرنے کا رواج پڑا [۳۰]

حضرت امیر معاویہؓ نے ۶۰ / ۶۸۰ء میں وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی استحکام حکومت ختم ہو گیا۔ ان کے جانشین یزید کے عہد میں سانحۂ کربلا اور واقعہ حرّہ پیش آئے اور پونے چار سال تک حکومت کرنے کے بعد وہ راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ یزید کی جگہ اس کا بیٹا معاویہ ثانی مسند نشین ہوا لیکن تین ماہ بعد ہی وہ تخت و تاج سے دستبردار ہو گیا۔ اس کی جگہ مروان بن الحکم تخت نشین ہوا لیکن دس ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ان حالات میں مکران و بلوچستان کی طرف حکام کی توجہ کم رہی۔

مروان بن الحکم کی وفات کے بعد اس کا لائق و فائق فرزند عبدالملک تخت نشین ہوا۔ کچھ عرصے تک وہ داخلی مسائل میں بُری طرح الجھا رہا اور جب اس جانب سے اسے فرصت ملی تو اس نے مکران اور بلوچستان کی طرف توجہ مبذول کی۔ خلیفہ عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو عراق کا گورنر اور مشرقی ممالک کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا۔ [۳۱ الف]

جب حجاج بن یوسف مشرقی ممالک کا نگرانِ اعلیٰ مقرر ہوا تو ان دنوں

سفہوی بن لام الحمامی مکران کا گورنر تھا۔ حجاج نے اس کی جگہ سعید بن اسلم کلابی کو مکران کا گورنر مقرر کیا۔ وہ بڑا قابل منتظم اور تجربہ کار فوجی افسر تھا۔ اس نے مکران میں کئی سرکش قبائل کو اطاعت کا جُوا پہننے پر مجبور کر دیا اور ان سے خراج اور جزیہ کے واجبات وصول کئے۔ اس کے اس قدام سے حجاج بن یوسف بڑا خوش ہوا۔ سعید بن اسلم نے سابق گورنر سفہوی کو اپنے ماتحت کام کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اتنی سی بات پر دونوں میں تکرار ہو گئی جو سفہوی کے قتل پر منتج ہوئی[۱۳۱] جب اس کے قتل کی خبر اس کے طرفدار علافیوں کو ملی تو انہیں بڑا رنج ہوا کیونکہ وہ ان کا خاص آدمی تھا۔ انہوں نے سفہوی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے سعید بن اسلم کے خلاف فوجکشی کی اور انہوں نے ایک جھڑپ میں سعید کو ٹھکانے لگا دیا۔ سعید کے قتل کے بعد علافیوں نے مکران میں اپنے قدم جمالئے اور اس طرح یہ علاقہ حجاج بن یوسف کے تسلّط سے آزاد ہو گیا[۱۳۲]

حجاج بن یوسف نے مجاعہ بن سعر تمیمی کو مکران بھیجا۔ وہ بڑا تجربہ کار فوجی افسر تھا اور اس سے قبل عمان میں خوارج کے مقابلے میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا۔ مجاعہ نے مکران پہنچتے ہی ایک ممتاز علافی سردار سلیمان کا سر کاٹ کر حجاج کی خدمت میں بھجوا دیا اور اسے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ بہت جلد علافیوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ ان حالات میں علافی اپنے سردار محمد بن حارث کی قیادت میں مکران سے نقلِ مکان کر کے سندھ میں داخل ہو گئے[۱۳۳] علافیوں کے مکران سے اخراج کے بعد مجاعہ نے اس علاقے میں بہت سی فتوحات کیں۔

مکران میں ایک سال قیام کے بعد مجاعہ نے وفات پائی اور اس کی جگہ محمد بن ہارون کا تقرر ہوا۔ اس نے بھی حجاج بن یوسف کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ علافیوں کے ساتھ کوئی رُو رعائت نہیں کرے گا۔

دوسری جانب جب علافی سندھ میں داخل ہوئے تو ان دنوں راجہ داہر اپنے ایک حریف حاکم رمل کے ساتھ برسرپیکار تھا۔ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کی تحقیق کے مطابق رمل موجودہ جیسلمیر کے علاقے میں تھا[۱۳۴]۔ علافیوں نے اس جنگ میں راجہ داہر کی مدد کی اور میدان جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ راجہ داہر نے ان کی

جرأت اور شجاعت سے متاثر ہو کر انہیں اپنی مملکت میں پناہ دے دی اور گذارے کے لئے جاگیریں عطاء کیں ۔ راجہ داہر نے علافیوں کے سردار محمد بن حارث کو اپنے دربار میں جگہ دی اور جنگی امور میں اس سے مشورے لینے لگا۔[۳۵] جب حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کے خلاف مہمات بھیجیں تو راجہ داہر ملکی دفاع سے متعلق امور میں محمد بن حارث علافی سے مشورہ کیا کرتا تھا۔[۳۶] جب حجاج بن یوسف کو یہ اطلاع ملی کہ راجہ داہر نے اس کے مخالفین اور اسلامی حکومت کے باغیوں کو سندھ میں پناہ دے دی ہے تو اس نے راجہ داہر سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا ۔ راجہ داہر نے یہ مطالبہ پورا کرنے سے صاف انکار کر دیا ۔ اس بات پر حجاج بن یوسف کے تعلقات راجہ داہر کے ساتھ کشیدہ ہو گئے۔

طبری (م ۳۱۰ھ / ۹۲۳ء) ، بلاذری (م ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) ، ابن اثیر (م ۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء) اور ابن کثیر (م ۷۷۴ھ / ۱۳۷۳ء) جیسے معتبر مؤرخوں کی لکھی ہوئی تواریخ کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عبدالملک بن مروان کے عہدِ خلافت میں اُموی حکومت کے باغی پناہ لینے کے لئے سندھ اور پنجاب کا رخ کرتے تھے ۔ علافیوں اور عبدالرحمٰن بن عباس ہاشمی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ۔

عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث ، عبدالملک بن مروان کا ایک نامور اور تجربہ کار فوجی افسر تھا ۔ اسے سیستان میں باغی ترکوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا ۔ اسے ترکوں کے مقابلے میں کامیابی ہوئی لیکن بعض فوجی امور پر اس کا حجاج بن یوسف کے ساتھ شدید اختلاف ہو گیا۔[۳۷] ابن اشعث نے حجاج کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور عوام سے کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ کی بالا دستی کے وعدے پر بیعت لینا شروع کر دی ۔ ابن اشعث نے تستر کے نواح میں حجاج بن یوسف کو شکست فاش دی اور آگے بڑھ کر بصرے پر قبضہ کر لیا ۔ حجاج بن یوسف کی شکست سے عراق کے حالات دگرگوں ہو گئے لیکن اس کے باوجود حجاج نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر ابن اشعث کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا ۔ ابن اشعث نے میدان جنگ سے فرار ہو کر اپنے ایک حلیف زنبیل کے ہاں سیستان میں پناہ لی۔[۳۸] زنبیل نے کچھ تو حجاج بن یوسف کے خوف سے اور کچھ انعام کے لالچ میں ابن اشعث کا سر کاٹ کر حجاج بن یوسف کی خدمت میں بھجوا دیا۔[۳۹]

ابن اشعث کے ایک ساتھی عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب (م ۱۰۲ھ / ۷۱۹ء) بنو ہاشم کے چشم و چراغ اور تلوار کے دھنی تھے۔ انہوں نے ابن اشعث کی بغاوت میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس کی شکست کے بعد حجاج بن یوسف کے انتقام سے بچنے کے لئے عبدالرحمٰن اپنے سپاہیوں سمیت کرمان، زرنج، بست اور ہرات ہوتے ہوئے کوہ سلیمان عبور کرکے پنجاب میں داخل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے ضلع جھنگ کے ایک گاؤں زرور میں قیام کیا۔ یہ گاؤں بعد میں ان کے نام کی مناسبت سے "پیر عبدالرحمٰن" کہلانے لگا۔ حال ہی میں ان کی سوانح عمری شائع ہوئی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن کی داہر کی مملکت میں پناہ گزین علافیوں کے ساتھ خط و کتابت رہتی تھی اور وہ مل کر اُموی حکومت کے خلاف محاذ قائم کرنا چاہتے تھے۔[۲۸]

اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ تبدیل کر دیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے بحرین کے عرب قبائل بنو تمیم اور بنو عبدالقیس بحری اسفار کے عادی تھے اور ان کے کئی خاندان سراندیپ (موجودہ سری لنکا) میں آباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے چند خاندانوں کے سربراہ وہیں فوت ہو گئے تو ان کے اہل و عیال وطن واپس جانے کے لئے جہازوں میں سوار ہو گئے۔ فتحنامہ سندھ کی روایت ہے کہ چند مُسلم خواتین زیارت بیت اللہ اور دارالخلافہ دمشق دیکھنے کے شوق میں اس قافلے میں شامل ہو گئیں۔[۲۹] سراندیپ کے حکمران نے اُموی خلیفہ سے تعلقات بڑھانے کی غرض سے اپنے قاصدوں کو قیمتی تحائف دے کر اسی قافلے کے ساتھ کر دیا۔ جب یہ جہاز آبنائے ہُرمز سے گزر کر گازرُون کے ساحل کے قریب پہنچے تو اچانک سمندر میں ایک زبردست طوفان اٹھا اور بادِ مخالف ان جہازوں کو کئی صد کلو میٹر پیچھے دھکیل کر سندھ کے ساحل سے قریب لے گئی۔ اس زمانے میں سندھ کے بحری قزاق بڑے بدنام تھے اور وہ گجرات کے ساحل سے لے کر آبنائے ہُرمز تک لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ ان سندھی قزاقوں نے ان جہازوں کو لُوٹ لیا اور بیشتر مسافروں کو گرفتار کر لیا۔ اس لُوٹ کھسوٹ اور پکڑ دھکڑ میں بنو تمیم کی ایک ذیلی شاخ بنو یربوع کی ایک مظلوم بچی نے "یا حجاج اغثنی" کہہ کر حجاج بن یوسف کو مدد کے لئے پکارا۔[۳۰] اس سانحہ میں گنتی

کے جو چند خوش نصیب افراد قزاقوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ گئے انہوں نے عراق پہنچ کر حجاج بن یوسف کو اس سانحہ کی اطلاع دی۔

میر محمد معصوم بھکری لکھتے ہیں کہ اس سے قبل بھی ایسا ہی ایک سانحہ شامی تاجروں کے ساتھ سندھ میں پیش آچکا تھا۔ یہ تاجر بغرض تجارت سندھ آئے اور یہاں ڈاکوؤں نے انہیں لُوٹ لیا۔ اس پکڑ دھکڑ میں چند تاجر ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے اور کچھ گرفتار ہوئے۔ جب حجاج بن یوسف کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو اس نے راجہ داہر سے بڑا سخت احتجاج کیا۔ راجہ نے اسے یہ جواب دیا کہ وہ ڈاکو اس کی دسترس سے باہر ہیں[۳۳]۔ اس سانحہ کا ذکر میر محمد معصوم بھکری (م ۱۰۱۹ھ / ۱۶۱۰ء) کے علاوہ اور کسی مؤرخ نے نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اس واقعہ کو سراندیپ کے قافلے کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سندھی قزاقوں کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور ان کی گوشمالی کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

حجاج بن یوسف نے اپنے دو معتمد فوجی افسروں کو راجہ داہر کے نام خط دے کر بھیجا اور انہیں یہ تاکید کی کہ وہ راستے کے حالات کا بغور جائزہ لیں اور دشمن کی فوجی قوت کا صحیح اندازہ لگا کر اسے مطلع کریں۔ راجہ داہر نے بظاہر حجاج بن یوسف کے خط کی بڑی تعظیم کی لیکن اس سانحہ سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ (حالانکہ قیدی سرکاری قید خانے میں مقیّد تھے)۔ تاہم اس نے قاصدوں کی دلجوئی کے لئے ان سے کہا کہ وہ اس معاملے کی چھان بین کرے گا اور اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو وہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دے گا اور مسافروں کا چھینا ہوا مال بھی انہیں واپس دلائے گا۔ داہر نے مختلف حیلوں بہانوں سے ان قاصدوں کو کچھ مدت کے لئے اپنے ہاں روکے رکھا اور پھر حجاج بن یوسف کے نام ایک معذرت نامہ لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ اس میں یہ مرقوم تھا کہ دیبل کی بندرگاہ میں بحری قزاق رہتے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ قابلِ صد مذمت ہے لیکن یہ قزاق اس کی دسترس سے باہر ہیں[۳۴]۔ دونوں قاصد راجہ داہر کا خط لے کر اور ضروری معلومات حاصل کرکے عراق پہنچے اور انہوں نے حجاج بن یوسف کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ حجاج بن یوسف نے یہ تمام صورتِ حال خلیفہ عبدالملک بن مروان کو لکھ بھیجی اور اس سے سندھ پر فوجکشی کی اجازت طلب کی۔

خلیفہ عبدالملک ابھی اس درخواست پر غور ہی کر رہا تھا کہ اسے پیامِ اجل مل گیا۔

عبدالملک (م ۷۰۵ء) کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ نئے خلیفہ نے حجاج بن یوسف کے اختیارات میں اضافہ کرتے ہوئے اسے کرمان، سیستان اور خراسان کا بھی نگران بنا دیا۔ اس نے خلیفہ ولید کو مطلع کیا کہ ماضی قریب میں سندھ میں مسلمان تاجر اور عورتیں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور بعض اب تک سندھیوں کی حراست میں ہیں۔ اس لیے اسے اجازت دی جائے کہ وہ ان کی رہائی اور ضبط شدہ اموال کی واپسی کے لئے کوشش کرے۔ خلیفہ کی طرف سے اس درخواست کا جواب آنے میں تاخیر ہوئی تو حجاج نے ایک اور درخواست بھیج دی اور اس کا جواب آنے تک فوجی تیاری شروع کر دی۔ ایک روائت یہ بھی ملتی ہے کہ اس نے خلیفہ ولید سے یہ کہا تھا کہ اس مہم پر جو خرچ اٹھے گا وہ اس سے دُوگنی (اور بقول میر علی شیر قانع تگنی) رقم خزانے میں جمع کرائے گا۔[۵]

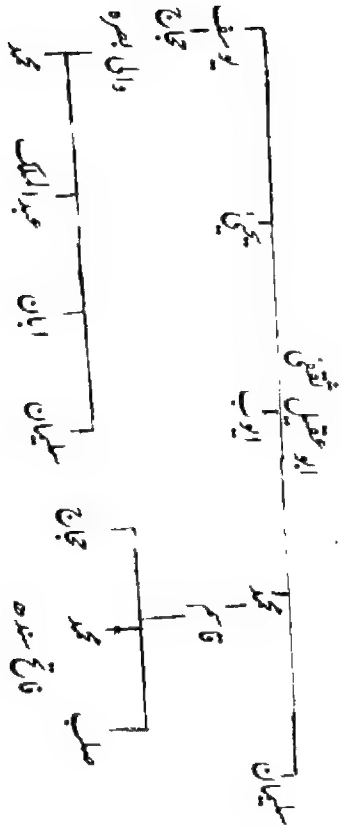
حجاج بن یوسف نے دربارِ خلافت سے اجازت ملتے ہی عبیداللہ بن نبہان کو مکران کے راستے سندھ روانہ کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ دیبل پر حملہ کرکے راجہ داہر کو قرار واقعی سزا دے کیونکہ وہ ڈاکوؤں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ عبیداللہ نے سندھ پہنچتے ہی جنگ چھیڑ دی جس میں وہ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے[۶] میرے فاضل دوست اور بزرگ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (م ۱۹۵۹ء) کی تحقیق کے مطابق کراچی کے تفریحی علاقے کلفٹن میں سخاری عبداللہ شاہ کا مزار درحقیقت عبیداللہ بن نبہان کا مرقد ہے۔[۷]

عبیداللہ بن نبہان کی مہم ناکام ہونے کے بعد حجاج بن یوسف نے بدیل بن طہفہ بجلی کو دیبل پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس وقت عمان میں مقیم تھا[۸] حجاج بن یوسف کا حکم ملتے ہی بدیل تین صد سپاہیوں کے ہمراہ خلیج فارس عبور کرکے مکران پہنچا۔ مکران کے والی محمد بن ہارون نے حجاج بن یوسف کے فرمان کے مطابق تین ہزار سپاہی بدیل کی کمان میں دے دیئے۔ وہ اس مختصر سی جمعیت کے ساتھ دیبل پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دیبل کے باشندوں نے راجہ داہر کو اس کی آمد کی اطلاع دی تو اس نے اپنے بیٹے جے سنگھ کو، جسے عرب مؤرخین جیسیہ لکھتے ہیں، بدیل کے مقابلے کو بھیجا۔

وہ بڑے سازو سامان اور چار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ طرفین کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ہاتھیوں کو دیکھ کر بدیل کا گھوڑا بدکنے لگا تو اس نے اپنے سر سے عمامہ اتار کر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھ دیا۔ فتحنامہ سندھ کی روایت کے مطابق بدیل نے دشمن کے اسّی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر جامِ شہادت نوش کیا۔[۴۹] اس کی شکست خوردہ فوج بہزار دِقّت مکران پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ حجاج بن یوسف کو اس مہم کی ناکامی اور بدیل کی شہادت کی اطلاع ملی تو اسے بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے اپنے مؤذن سے کہا کہ وہ جب نماز کے لئے اذان دیا کرے تو اسے بدیل کی شہادت یاد دلا دیا کرے تاکہ وہ اس کا انتقام لینے کی تدبیر سوچتا رہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ رائے بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے کہ راجہ داہر اور بحری قزاقوں کی روش اور پے درپے دو مہموں کی ناکامی نے حجاج بن یوسف اور اموی خلافت کے لئے وقار کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔[۵۰] اگر حجاج بن یوسف اس وقت تساہل سے کام لیتا تو عین ممکن تھا کہ راجہ داہر آئندہ ممکنہ حملوں سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو مکران اور بلوچستان سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ ان حالات میں حجاج بن یوسف نے اپنے قبیلے بنو ثقیف کے ایک جواں سال، جواں بخت اور جواں ہمت غازی و مجاہد محمد بن قاسم کو سندھ پر فوجکشی کے لئے تیار کیا۔

ہمارے مؤرخین نے بلا تحقیق محمد بن قاسم کو حجاج کا داماد اور بھتیجا لکھ دیا ہے۔ ابنِ حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ / ۱۰۶۴ء) عربوں کے نسب کے بڑے ماہر تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حجاج کی کوئی بیٹی نہ تھی۔ مندرجہ ذیل شجرے پر، جو راقم نے "جمہرۃ الانساب العرب" کی مدد سے تیار کیا ہے[۵۱] ایک نظر ڈالنے سے محمد بن قاسم کے بھتیجے ہونے کی بھی حقیقت واضح ہو جاتی ہے:


ابو عقیل ثقفی
سلیمان
محمد
ایوب
یحییٰ
یوسف
قاسم
حجاج
والی بصرہ
صلب
محمد
فاتح سندھ
حجاج
سلیمان
ابان
عبدالملک
محمد

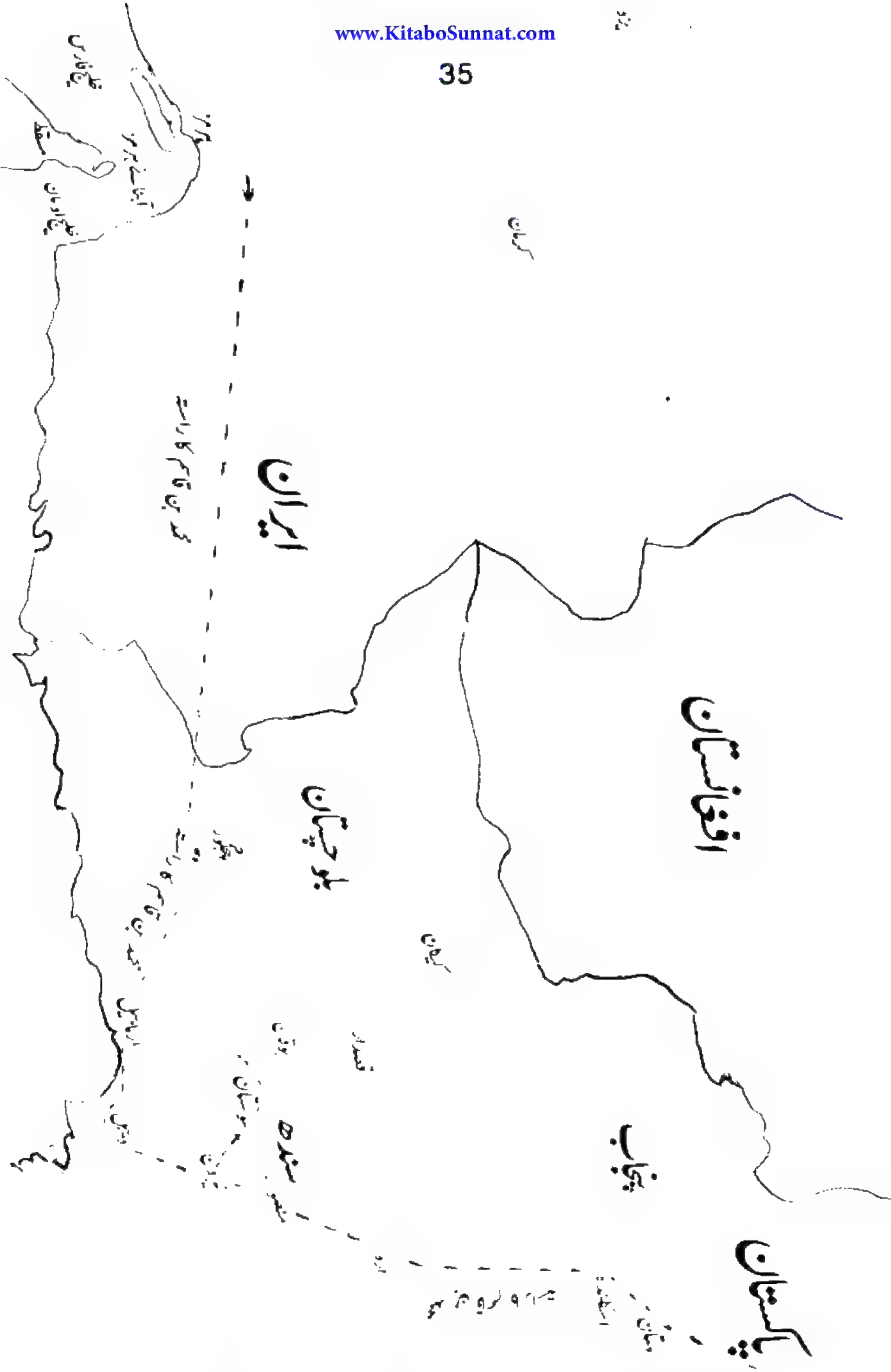
اس شجرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کے چچا کا پوتا تھا۔

محمد بن قاسم اس وقت شیراز میں مقیم تھا۔ اس نے حجاج بن یوسف کا فرمان ملتے ہی سندھ پر حملہ کرنے کے لئے تیاری شروع کر دی۔ پہلی دو مہموں کی ناکامی سے حجاج بن یوسف نے بھی سبق سیکھا تھا اس لئے اس بار اس نے ضرورت سے زیادہ سامان رسد و حرب ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ ابن اثیر (م ۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء) لکھتے کہ اس بار حجاج نے اس قدر احتیاط اور سمجھ بوجھ سے کام لیا کہ سوئی دھاگے جیسی معمولی اشیاء بھی لشکریوں کے ساتھ کر دیں[۵۲]۔ (ابنِ اثیر کے الفاظ ہیں جهز بكل ما يحتاج اليه حتى المسال والابر و الخيوط)۔

دوسری جانب حجاج بن یوسف نے ابنِ مغیرہ اور خریم بن عمرو کو بھاری سامان حرب کے ساتھ بحری جہازوں کے ذریعے دیبل روانہ کیا۔ خریم بن عمرو حجاج بن یوسف کا آزمودہ فوجی افسر تھا اور اسے بحری جنگوں کا بڑا وسیع تجربہ تھا۔ ان دونوں کو دیبل روانہ کرنے کے بعد حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو مطلع کیا کہ وہ فوراً دیبل روانہ ہو جائے اور اس کے دیبل پہنچتے ہی ابنِ مغیرہ اور خریم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ ان سے پہلے دیبل پہنچ جائے تو جنگ شروع کرنے سے پہلے ان کی آمد کا انتظار کرے[۵۳]۔

حجاج بن یوسف نے عبدالرحمن بن سلیم الکلبی، سفیان بن الابرد، قطن بن مدرک الکلابی، جراح بن عبداللہ، مجاشع بن نوبہ، ابوحکیم شیبانی، نباتہ بن حنظلہ، جعونہ السلمی، نوبہ بن ہارون، سلیمان قسیری اور احنف بن قیس جیسے فنِ حرب کے ماہرین کو محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ روانہ کیا۔

حجاج بن یوسف کا حکم ملتے ہی محمد بن قاسم سامان رسد و حرب سے لدے ہوئے تین ہزار بختی اونٹوں، چھ ہزار شہسواروں اور اتنے ہی برق رفتار شتر سواروں کے ہمراہ سندھ روانہ ہوا[۵۴]۔ حجاج نے چلتے وقت اسے یہ نصیحت کی کہ وہ ہر وقت


ایران
افغانستان
بلوچستان
سندھ
پنجاب

اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور کسی حالت میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے ۔ جب وہ دشمن کے علاقے میں پہنچے تو ہمیشہ کھلی اور ریتلی جگہ میں کیمپ لگائے ۔ نیز دشمنوں کے ساتھ مقابلے کی صورت میں وہ اپنی فوج کو گروہوں کی صورت میں لڑائے ۔ حجاج کو یہ معلوم تھا کہ سندھی عربوں کے مقابلے میں جنگی ہاتھی ضرور لائیں گے ۔ اس لئے اس نے محمد بن قاسم سے کہا کہ جب ہاتھی اس کے لشکر پر حملہ کریں تو مجاہدین اپنی جگہ جم کر ان پر تیر برسائیں اور وہ دشمنوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے درزیوں کی مدد لے اور اپنے گھوڑوں کو شیروں اور ہاتھیوں جیسا بنا دے [55]

حجاج بن یوسف سے یہ ہدایات لے کر محمد بن قاسم شیراز سے ارمابیل روانہ ہوا ۔ سفر کے دوران اس نے مکران میں ایک ماہ قیام کیا ۔ مکران کے گورنر محمد بن ہارون نے ذاتی رنجش کے باوجود اس کی ہر ممکن مدد کی اور خود بھی اس کی فوج میں شامل ہو گیا ۔ بدقسمتی سے سفر کے دوران محمد بن ہارون بیمار ہوا اور ارمابیل کے نواح میں پہنچتے ہی وہ انتقال کر گیا ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق بیلہ شہر سے باہر جو مقبرہ " پیر آری " کے نام سے موسوم ہے ، وہ محمد بن ہارون کا مقبرہ ہے ۔ ان کے خیال میں آری ، ہارون کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۔ ماہرینِ فنِ تعمیر کے خیال میں مقبرے کی موجودہ عمارت غزنوی دور کی یادگار ہے [56]

محمد بن قاسم نے ارمابیل (موجودہ بیلہ) جانے سے قبل فنزپور (پنجگور ؟) فتح کیا اور اس کے بعد ارمابیل پر اسلامی جھنڈا لہرا دیا ۔ وہ ارمابیل سے نیرون جانا چاہتا تھا کہ اسی دوران میں اسے حجاج بن یوسف کا خط ملا کہ وہ نیرون کا خیال چھوڑ کر دیبل جائے اور دشمن کے علاقے سے گذرتے ہوئے جہاں کہیں کیمپ لگائے وہاں حفاظت کی غرض سے اپنے لشکر کے گرد خندق ضرور تیار کروا لے ۔ اسی خط میں حجاج بن یوسف نے اسے یہ بھی لکھا مجاہدین زیادہ وقت بیدار رہیں اور ان میں جو قرآن خوان ہوں ، وہ اپنا زیادہ وقت تلاوت میر صرف کریں ، باقی لشکری اللہ کے ذکر میں مصروف رہیں اور صرف اسی ذاتِ والا صفات سے مدد مانگیں [57] حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو یہ بھی لکھا کہ دیبل پہنچتے ہی وہ اپنے لشکر کے گرد بارہ گز چوڑی اور چھ گز گہری خندق تیار کروا لے ۔ اگر دشمن اسے گالیاں دیں یا اشتعال انگیز نعرے لگائیں تو بھی وہ جنگ شروع نہ کرے

اور اس کے اگلے حکم کا انتظار کرے [59]

محمد بن قاسم ارمابیل سے دیبل روانہ ہوا۔ اس وقت راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ نیرون (موجودہ حیدر آباد) میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے والد کو عرب لشکر کی آمد کی اطلاع دی اور مقابلے کی اجازت چاہی۔ راجہ داہر نے علافیوں کے سردار محمد بن حارث سے محمد بن قاسم اور اس کے لشکر کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے راجہ کو بتایا کہ امیر لشکر محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کا قرابتدار ہے اور وہ اپنے ساتھ تجربہ کار فوجی اور جرأت مند افسر لے کر آیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے پاس بہترین گھوڑے اور اعلیٰ قسم کا اسلحہ ہے، اس لئے اس سے ٹکّر لینی مناسب نہیں ہے[59]۔ علافیوں کے امیر سے مشورے کے بعد راجہ داہر نے جے سنگھ کو محمد بن قاسم کا مقابلہ کرنے سے روک دیا[60]

اسی اثنا میں محمد بن قاسم دیبل پہنچ گیا اور چند روز کے فرق سے ماہِ محرّم ۹۳ ھ / ماہِ اکتوبر ۷۱۱ء میں جمعہ کے روز ابن مغیرہ اور خریم بھی بھاری سامان اور منجنیقیں لے کر وہاں پہنچ گئے۔ مؤرخین نے جمعہ کے دن ماہ محرم کی تاریخ نہیں لکھی۔ عبدالقدوس ہاشمی کی مرتب کردہ تقویم اسلامی کی رو سے ماہ محرم میں ۲۳ اکتوبر، ۳۰ اکتوبر، ۶ نومبر اور ۱۳ نومبر کو جمعے کا دن تھا ان تاریخوں میں سے کسی ایک میں ابن مغیرہ اور خریم دیبل پہنچے تھے[61] ان کی آمد سے محمد بن قاسم کو بڑی تقویت ملی اور اس کا حوصلہ بلند ہوا۔

محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کے مشورے پر اپنے لشکر کے گرد خندق تیار کروائی اور اپنے فوجی ہیڈ کوارٹر پر پرچم نصب کیا۔ اس نے مناسب جگہوں پر منجنیقیں نصب کروائیں۔ خلیفہ ولید نے اپنے خصوصی احکام کے تحت عروس نامی ایک منجنیق بھیجی تھی جسے پانصد افراد چلاتے تھے۔ اسی سے اس کی قوت اور کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محمد بن قاسم نے دیبل کا محاصرہ کر لیا جس نے قدرے طول کھینچا۔ دیبل شہر کے وسط میں ایک بڑا مندر تھا جس کی کرسی سطح زمین سے چالیس گز بلند تھی اور اس کے اوپر اتنا ہی اونچا منڈپ تھا۔ اس مندر کے کلس پر ہر وقت سرخ رنگ (اغلباً گیروے رنگ) کا ایک پھریرا لہراتا رہتا تھا اور سمندر کی تیز ہوا اسے پورے شہر پر گھما دیتی تھی[62] دیبل کے شہریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک یہ پھریرا اس کا محافظ ہے ... آتا

رہے گا، وہ دشمن سے محفوظ و مامون رہیں گے۔

فتحنامہ سندھ کی روائت ہے کہ سندھی، مجاہدین سے ٹکر لینے پر آمادہ تھے لیکن حجاج بن یوسف ہر روز خط کے ذریعے محمد بن قاسم کو توقف کرنے کا مشورہ دیتا تھا۔ آٹھویں روز مجاہدین کو حملہ کرنے کی اجازت ملی۔ مجاہدین نے اپنے کیمپ سے باہر نکل کر دشمنوں پر حملہ کیا اور انہیں قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔[۶۳]

اسی دوران میں قلعے سے ایک برہمن آکر محمد بن قاسم سے ملا اور اپنے لئے امان طلب کی۔ امان ملنے پر اس نے کہا کہ اس کے پاس نجوم کی چند کتابیں ہیں اور ان میں یہ مرقوم ہے کہ سندھ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ اس نے محمد بن قاسم کو بتایا کہ اہلِ دیبل کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک مندر پر پھریرا لہراتا رہے گا، وہ مامون و محفوظ رہیں گے۔ اس لئے کوشش کر کے مندر کے کلس اور پھریرے کو گرا دیں اور جب اہلِ دیبل اس "مقدس" پھریرے کا یہ حشر دیکھیں گے، تو ہمت ہار جائیں گے۔[۶۴]

برہمن کے کہنے پر محمد بن قاسم نے جعونہ بن عتبہ السلمی کو اپنے حضور طلب کیا۔ وہ منجنیق چلانے کا بڑا ماہر تھا۔ محمد بن قاسم نے اس سے کہا کہ وہ ایسا نشانہ باندھے کہ مندر کا کلس اور پھریرا دونوں زمین پر آ رہیں اور اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے دس ہزار درہم انعام میں ملیں گے۔ جعونہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ وہ عروس کے ذریعے تین پتھر پھینک کر کلس گرا دے گا اور اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو پھر امیر لشکر بے شک اس کے ہاتھ کٹوا دے۔ محمد بن قاسم نے یہ شرط حجاج بن یوسف کو لکھ بھیجی۔ نویں روز اسے کا جواب آگیا کہ یہ شرط منظور ہے۔[۶۵]

ادھر وہ برہمن جس نے امان ملنے پر یہ راز محمد بن قاسم کو بتایا تھا کسی نہ کسی طرح دوبارہ شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنی کتابوں کے حوالے دے کر ایک جانب تو دیبل والوں کے حوصلے پست کر دیئے اور دوسری جانب مسلمان قیدیوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ حجاج بن یوسف کا ایک قرابتدار فوج لے کر دیبل پہنچ چکا ہے اور عنقریب یہ شہر اس کے ہاتھوں فتح ہو گا اور انہیں جلد ہی رہائی ملے گی۔

حجاج بن یوسف کا خط ملنے پر محمد بن قاسم نے جعونہ کو طلب کیا۔ اس نے ایک خاص مقام پر عروس نصب کی اور پہلے ہی نشانے میں مندر کا کلس توڑ دیا۔

دوسرے نشانے میں منذپ بھی زمین پر آرہا ۔ پھریرے اور مندر کا یہ حشر دیکھ کر اہلِ دیبل ہمت ہار گئے[66] دیبل کا قلعہ دار رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گیا ۔
مندر کے انہدام کے ساتھ ہی محمد بن قاسم نے عام حملے کا حکم دیا ۔ اس حملے میں اہلِ بصرہ نے بڑی ہمت اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اور شہر کی فصیل پر چڑھ کر اندر کود گئے ۔ انہوں نے لڑ بھڑ کر شہر کا دروازہ کھول دیا اور مجاہدین شہر میں داخل ہو گئے ۔ دیبل کے باشندوں نے محمد بن قاسم سے امان طلب کی تو اس نے جواب دیا کہ اسے امان دینے کا اِذن نہیں ہے[67] اس نے اس موقع پر دشمن کے فوجیوں کو قتل کروا دیا اور تین روز تک ہنگامہ دار و گیر جاری رہا[68] چوتھے روز امیر لشکر نے عام شہریوں کو امان دے دی ۔

محمد بن قاسم دیبل کے مندر میں داخل ہوا ۔ اس وقت وہاں سات سو دیو داسیاں زرق برق لباس میں ملبوس موجود تھیں[69] ان کا کام بتوں کے سامنے ناچنا تھا۔ ان دیوداسیوں کا ہندوؤں کے مذہبی طبقے کی اخلاقی بے راہ روی میں بڑا ہاتھ تھا ۔ محمد بن قاسم کے حکم پر انہیں حراست میں لے لیا گیا[70] دیبل کے قید خانے میں سراندیپ کے قافلے کے قیدی اور بدیل بن طہفہ کی شکست خوردہ فوج کے کچھ سپاہی نظر بند تھے ، انہیں رہا کیا گیا ۔ امیرِ لشکر ، داروغۂ زندان مسمیٰ گیلا (عربی اِملا قبلہ) کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن قیدیوں نے اس کے حسن سلوک کی بڑی تعریف کی ۔ اس پر محمد بن قاسم اس سے بڑا خوش ہوا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ۔ گیلا پہلے ہی مسلمان قیدیوں کے اخلاق و اطوار اور طریقِ عبادت سے متاثر ہو چکا تھا اس لئے جب محمد بن قاسم نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ فوراً مسلمان ہو کر تبع تابعین کے زمرے میں شامل ہو گیا ۔ امیرِ لشکر نے اسے دیبل میں اپنے نائب کا مشیر مقرر کیا ۔[71]
محمد بن قاسم نے دیبل کے مالِ غنیمت کا خمس اور وہاں کے مفرور قلعدار کی دو بیٹیاں حجاج بن یوسف کی خدمت میں روانہ کیں ۔ اس نے دیبل شہر کے وسط میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور وہاں چار ہزار مسلمانوں کو آباد کیا گیا جس سے دیبل کا اسلامی تشخص اُبھرا ۔[72]

جب راجہ داہر کو دیبل پر مسلمانوں کے قبضے کی خبر ملی تو اس نے بے

سنگھ کو حکم دیا کہ وہ نیرون سے برہمنا باد (موجودہ منصورہ) پہنچے اور اس کے دفاع کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ دوسری جانب دیبل کے انتظامات سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نیرون (موجودہ حیدر آباد) روانہ ہوا۔ اس نے بھاری سامان اور منجنیقیں دریائے سندھ کی ایک شاخ ساکرہ ندی کے راستے نیرون روانہ کیں اور خود سیسم کی جانب متوجہ ہوا[۳]

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق سیسم، ٹھٹھہ اور گوجو کے درمیان " تھاروبل " کے پاس واقع تھا۔ یہاں ماہرِ آثارِ قدیمہ موجمدار نے بدھوں کے معابد دریافت کئے ہیں۔ محمد بن قاسم نے نیرون جاتے ہوئے سیسم کا راستہ اس لئے بھی اختیار کیا کہ اس نواح میں ھالیجی، کینجھر اور سناہری نام کی میٹھے پانی کی تین بڑی جھیلیں ہیں جہاں سے وہ اپنے لشکر کی ضرورت کے لئے پانی لے سکتا تھا[۴]

نیرون جاتے ہوئے محمد بن قاسم کو راجہ داہر کا دھمکی آمیز خط ملا جس میں اسے بدیل کا انجام یاد دلاتے ہوئے لکھا کہ وہ اس کے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔[۵]

محمد بن قاسم نے اس کے جرائم گنوائے اور اسے سراندیپ سے آنے والے جہازوں کو لوٹنے اور عرب مسافروں کو قید میں رکھنے کا ذکر کیا۔ محمد بن قاسم نے اس پر یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ اسے ان جرائم کی سزا دینے کی غرض سے سندھ آیا ہے[۶]

دیبل سے چل کر محمد بن قاسم نے ساتویں روز دریائے سندھ عبور کیا اور نیرون کے بالمقابل خیمہ زن ہوا۔ اس نے نیرون کے قلعدار کے نام یہ پیغام بھیجا کہ دیبل کی فتح سے اس کا غصہ فرو ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر وہ اس کی اطاعت قبول کر لے تو اس کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کیا جائے گا۔[۷] اس پر قلعدار نے غلّے کی بڑی مقدار اور چند تحائف محمد بن قاسم کو بھجوائے اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ مجاہدین بلا مزاحمت نیرون میں داخل ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے وہاں اپنے افسر مقرر کئے اور ایک مسجد تعمیر کروائی جسے آباد رکھنے کے لئے امام اور مؤذن متعین کئے۔[۸]

نیرون میں چند روز لشکریوں کو آرام دینے کے بعد محمد بن قاسم نے سیوستان (موجودہ سیہون) کا رخ کیا۔ اس کے لئے اسے دوبارہ دریا عبور کرنا پڑا۔ سیوستان میں ان دنوں راجہ داہر کا بھتیجا بجے رائے (جسے عرب مؤرخین بجرا لکھتے ہیں) گورنر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ خود تو ہندو دھرم کا پیرو تھا لیکن اس کی رعایا بدھ

مت سے تعلق رکھتی تھی جب مجاہدین کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو بدھوں کے ایک وفد نے بجے رائے سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ ان کے دھرم میں جنگ و جدل کی ممانعت آئی ہے اس لئے وہ خونریزی پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے بجے رائے سے یہ بھی کہا کہ محمد بن قاسم عام شہریوں کو امان دے دیتا ہے اور پھر وعدہ ایفا کرتا ہے۔ بجے رائے نے اپنی رعایا کی رائے اور جذبات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انہی ایام میں محمد بن قاسم کے متعین کردہ جاسوس یہ خبر لائے کہ عام شہری لڑنے کے خلاف ہیں اور صرف بجے رائے اپنی ہٹ پر قائم ہے۔ محمد بن قاسم نے سیوستان پہنچ کر شہر کے اس دروازے سے باہر، جو صحرا کی جانب کھلتا تھا، ڈیرہ ڈال دیا اور اپنے سپاہیوں کو لڑنے کا حکم دیا[79]۔ جب بجے رائے نے یہ محسوس کیا کہ شہر کا محاصرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے تو وہ رات کے وقت سیوستان سے فرار ہو کر بودھیہ کے حاکم کاکا کے پاس پہنچ گیا۔ بودھیہ کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ علاقہ موجودہ ضلع دادو میں منچھر جھیل کے کنارے پر تھا[80]۔

بجے رائے کے فرار کے بعد محمد بن قاسم نے سیوستان پر قبضہ کر لیا اور گرد و نواح کے علاقوں کو زیر کرنے کے لئے اپنے افسر مقرر کئے۔ سیوستان میں تین روز قیام کے بعد محمد بن قاسم سیویس روانہ ہوا۔ یہ قصبہ بھی ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے خیال کے مطابق منچھر جھیل کے کنارے آباد تھا اور ان دنوں "شاہ حسن" کے نام سے موسوم ہے۔ وہاں اس عہد کے آثارِ قدیمہ موجود ہیں[81]۔

جب محمد بن قاسم سیویس میں مقیم تھا تو اس نواح کے باشندوں نے لشکر اسلام پر شبخون مارنے کا منصوبہ تیار کیا۔ انہوں نے بودھیہ کے حاکم کاکا سے بھی اس کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ ان کا ارادہ تو درست ہے لیکن علمِ نجوم کی کتابوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اب اس علاقے پر مسلمان حکومت کریں گے۔ اس کے باوجود ایک ہزار کے قریب منچلے جوان شبخون مارنے نکلے۔ اتفاق سے رات کی تاریکی میں وہ راستے میں بھٹک گئے اور چار ٹولیوں میں بٹ گئے[82]۔ صبح وہ بے نیل و مرام کاکا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ ہمت و مردانگی کی بات کرتے ہیں تو وہ کسی سے کم نہیں ہے اور وہ اسے بارہا آزما بھی چکے ہیں لیکن علمِ نجوم کی رُو سے مسلمان اس ملک کو فتح کر لیں گے، اس لئے اب ان کی مخالفت

بیکار ہے[83]

کاکا نے اس موقع پر بڑی سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور وہ محمد بن قاسم سے ملنے گیا۔ جب مؤخر الذکر کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے ایک معزز فوجی افسر نباتہ بن حنظلہ کو کاکا کے استقبال کے لئے بھیجا۔ محمد بن قاسم نے کاکا کی عزت افزائی کرتے ہوئے اسے خلعت پہنایا اور اپنے دربار میں کرسی پیش کی[84] اس وقت اس نے شبخون والا واقعہ دہراتے ہوئے منجموں کی پیشگوئی کا بھی ذکر کیا۔ کاکا نے محمد بن قاسم کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر نہ صرف یہ کہ اس کی اطاعت قبول کر لی بلکہ اس کا مشیر بھی بن گیا۔

بودھیہ سے محمد بن قاسم سیویس آیا اور دو روز کی جنگ کے بعد اسے فتح کر لیا۔ بجے رائے اور کئی سندھی عمائدین سیویس سے فرار ہو کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے امان طلب کی اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی اثناء میں حجاج بن یوسف کا خط پہنچا جس میں محمد بن قاسم سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر کا خیال ترک کر کے نیرون پہنچے اور وہاں جا کر راجہ داہر کے مقابلے کی تیاری کرے۔ حجاج بن یوسف نے اسے یہ بھی باور کرایا کہ اگر وہ داہر پر فتح پا لے تو پھر پورا علاقہ از خود زیر ہو جائے گا[85]

حجاج بن یوسف کا خط ملتے ہی محمد بن قاسم نیرون روانہ ہو گیا۔ داہر کو اس کی نیرون کی جانب پیشقدمی کی اطلاع ملی تو اس نے دانشمندوں اور منجموں کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کیا۔ اس موقع پر منجموں نے علمِ نجوم کی رُو سے مسلمانوں کی کامیابی کی پیشگوئی کی[86] اس کے باوجود راجہ داہر نے ہمت نہ ہاری اور وہ اپنی فوج لے کر کولاب گپیری پہنچ گیا۔ ان دنوں یہ مقام گپیرہ کے نام سے موسوم ہے[87] یہاں فریقین میں ایک خونریز جھڑپ ہوئی جس میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ اس موقع پر غنیم کے بہت سے سپاہی دریا میں غرق ہو گئے۔

کولاب گپیری کا معرکہ سر کرنے کے بعد محمد بن قاسم، راجہ داہر کے پایہ تخت الور پہنچا۔ اسے آج کل اروڑ کہتے ہیں اور اس کے کھنڈرات روہڑی سے تین میل جانبِ مشرق نہر نارا کے کنارے تاحال موجود ہیں۔ (راقم تین بار وہاں جا چکا ہے۔

وہاں بابا گنج شکر کا مزار اور فصیل کے نشانات موجود ہیں ۔ یعقوبی لکھتا ہے کہ الور کی فصیل بہت مضبوط تھی ۔ وہاں ایک قدیم مسجد بھی کھنڈر کی صورت میں عرب شہسواروں کی مرثیہ خوانی کر رہی ہے) ۔ محمد بن قاسم نے الور کا محاصرہ کر لیا اور منجنیقوں کے ذریعے پتھر اور نَفت (کھولتا ہوا تیل) شہر پر پھینکنے کا حکم دیا ۔ یہ سلسلہ نو دس روز تک جاری رہا ۔

اس وقت داہر کا بیٹا گوپی (جسے عرب مؤرخین فوفی لکھتے ہیں) الور سے قریب بغرور میں مقیم تھا ۔ محمد بن قاسم نے ازرہِ احتیاط سلیمان قشیری کو چھ صد سواروں کے ہمراہ روانہ کیا اور اسے اس بات کی سخت تاکید کی کہ گوپی کسی طرح بھی اپنے باپ کی مدد کو نہ پہنچ سکے[88]

۱۰ رمضان المبارک ۹۳ ھ / ۲۰ جون ۷۱۲ء کو راجا داہر بڑے کرّ و فر کے ساتھ محمد بن قاسم کے مقابلے کو نکلا ۔ اس وقت دس ہزار زرہ پوش جانباز اور تیس ہزار پیادے اس کے جلو میں تھے اور وہ خود ایک سفید ہاتھی پر سوار ہو کر فوج کی کمان کر رہا تھا[89] اس روز صبح سے شام تک گھمسان کی جنگ جاری رہی ۔ بلاذری لکھتا ہے کہ اس جیسی خونریز جنگ اس سے پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی ۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:
فاقتلوا قتالاً شدیداً لم یسمع بمثلہ۔ نماز مغرب سے قریب راجہ داہر کے ہاتھی پر نَفت گرا اور وہ دھاڑتا ہوا اپنی ہی فوج کی صفیں درہم برہم کرتا ہوا پانی کے ایک جوہڑ کی جانب بھاگا[90] ہاتھی کو یوں بھاگتے دیکھ کر مجاہدین نے اس پر تیروں کی بارش کر دی ۔ اتفاق سے ایک تیر راجہ داہر کے سینے میں دل سے قریب پیوست ہو گیا ۔ اس کے باوجود وہ ہودج سے اتر کر لڑنے لگا ۔ اتنے میں بنی کلاب کے ایک مجاہد نے اس زور سے اس کی پیشانی پر تلوار ماری کہ وہ گردن تک اُتر گئی[91]

راجہ داہر کے مرتے ہی چند برہمنوں نے اس کی لاش کیچڑ میں چھپا دی تاکہ اس کی فوج اور الور کے باشندے ہمت نہ ہار بیٹھیں ۔ اسی لئے محمد بن قاسم کو اس کی موت کا یقین نہ آیا ۔ وہ ہر ملنے والے سے داہر کے بارے میں استفسار کرتا تھا ۔ اتنے میں ایک برہمن اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور امان ملنے پر اس نے داہر کی موت کی تصدیق کی اور اسے اطمینان دلانے کی خاطر اس کی لاش کیچڑ سے نکالی ۔ ایک مجاہد نے

اس کا سر کاٹ کر محمد بن قاسم کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے باوجود اس نے شہادت طلب کی۔ اس پر راجہ داہر کی دو کنیزیں اس کے سامنے پیش کی گئیں اور انہوں نے تصدیق کی کہ یہ واقعی داہر کا سر ہے[92]۔ مجاہدین نے اس فتح کی بڑی خوشی منائی اور وہ رات بھر صلوٰۃ و تسبیح میں مشغول رہے۔

سندھیوں کی شکست کے وقت رانی لاڈی الور کے قلعے میں موجود تھی۔ داہر کی موت کا یقین دلانے کی غرض سے محمد بن قاسم نے اس کا کٹا ہوا سر الور بھجوایا۔ رانی لاڈی نے اپنی ایک کنیز سے داہر کے انجام کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے رانی کو بتایا کہ اس نے بچشم خود راجہ کا سر دیکھا ہے۔ کنیز کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی رانی کے ہوش اُڑ گئے اور وہ قلعے کی دیوار سے نیچے گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی شہر کے دروازے کھل گئے اور مجاہدین فاتحانہ انداز میں شہر میں داخل ہو گئے۔ اگلے روز جمعہ تھا، مجاہدین نے نمازِ جمعہ الُور میں ادا کی[93]۔ مؤرخِ شہیر یعقوبی نے اسے سندھ کا سب سے بڑا شہر بتایا ہے۔ الور کی فتح کے بعد سندھی جوق در جوق آکر اطاعت قبول کرنے لگے۔ محمد بن قاسم نے برہمنوں کو بہت سی مراعات دیں اور انہیں حسبِ سابق انتظامی عہدوں پر برقرار رکھا۔

ایک روایت کے مطابق داہر کی شکست کے وقت اس کے فرزند اور متعدد سندھی عمائدین قلعہ اسکندہ میں مقیم تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق جو زیادہ قرین قیاس ہے وہ اس وقت راوڑ میں مقیم تھے اور راجہ داہر کی ایک بیوہ رانی بائی بھی وہاں موجود تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ راجہ داہر میدان جنگ سے زندہ بچ کر نکل گیا ہے اور وہ جلد ہی راجستھان اور گجرات کے حکمرانوں سے مدد لے کر مسلمانوں کے مقابلے کو آئے گا۔ ان کا یہ وہم دُور کرنے کے لئے محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی ایک بیوہ رانی لاڈی کو راوڑ بھیجا۔ داہر کے بیٹوں نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی اور اسے کہا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل گئی ہے اس لئے وہ اس کی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ اس مشن کی ناکامی پر رانی لاڈی واپس چلی آئی[94]۔

ایک دن جے سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان حالات میں زندہ رہنے کی بجائے لڑ کر مرجانا ہی بہتر ہے۔ داہر کے وزیر سیاکر نے اسے یہ مشورہ دیا کہ

راجہ داہر مارا گیا ہے اور دشمنوں کا رعب ان کے لشکریوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس لئے ان حالات میں لڑنا مناسب نہیں ہے۔ اس نے یہ صلاح دی کہ اس وقت انہیں برہمنا باد جانا چاہیے۔ وہاں خزانہ بھی موجود ہے اور وہاں کے باشندے بھی شاہی خانوادے کے وفادار ہیں۔ اتفاق سے اس وقت محمد بن حارث علافی بھی وہیں موجود تھا اس نے بھی وزیر کے مشورے کی تائید کی۔ ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد جے سنگھ، رانی بائی اور سندھی عمائدین کو راوڑ میں چھوڑ کر برہمنا باد روانہ ہو گیا[95]

جے سنگھ کے راوڑ سے باہر نکلتے ہی محمد بن قاسم نے راوڑ پر حملہ کر دیا۔ راوڑ کا حصار بڑا مضبوط سمجھا جاتا تھا لیکن مجاہدین نے منجنیقوں کی مدد سے اس کا بُرج گرا دیا اور شہر میں داخل ہو گئے۔ اس موقع پر رانی بائی نے جوہر کی رسم ادا کی اور آگ کے الاؤ میں کود کر اپنی جان دے دی[96]۔

برہمنا باد جا کر جے سنگھ نے قرب وجوار کے ہندو حکمرانوں کے ساتھ اتحاد قائم کر کے مسلمانوں کو سندھ سے بے دخل کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس نے انہیں خط لکھ لکھ کر اپنی مدد کے لئے بلایا۔ محمد بن قاسم کو اس خطرناک منصوبے کا علم ہوا تو اس نے برہمنا باد کا رخ کیا اور راستے میں بہرور اور دھلیلہ نام کے دو قلعے سر کر لئے۔ بہرور کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مقام بدین کے علاقے میں تھا اور دھلیلہ موجودہ عمر کوٹ کے نواح میں تھا[97] مرورِ زمانہ سے دھلیلہ کا نام دمریلہ ہو گیا اور آج کل اسے دمبرلو کہتے ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق کی سندھ کی مہم کے ضمن میں دمریلہ کا ذکر آتا ہے[98] اس نے یہاں قیام بھی کیا تھا۔ دھلیلہ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے نوبہ بن ہارون کو وہاں کا قلعدار مقرر کیا۔ ان دونوں قلعوں پر قبضہ کرنے سے سندھ میں اسلامی حکومت کی سرحدیں راجستھان اور "کچھ" سے جا ملیں۔

اسی زمانے میں محمد بن قاسم نے گرد و نواح کے ہندو راجاؤں کے نام خط لکھ کر انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ انہی ایام میں راجہ داہر کے وزیر سیاکر نے بھی امان طلب کی اور وہ محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے وزیر کی پیشوائی کے لئے اپنے نامور فوجی افسروں کو بھیجا اور ملاقات کے وقت اس کی بڑی تکریم کی اور اسے خلعت و انعام سے نوازا۔ سیاکر کے خلوص و تدبر سے متاثر ہو کر محمد بن

قاسم نے اسے اپنا وزیر مقرر کیا اور ہر اہم معاملے میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔[99]

محمد بن قاسم بہرور اور دھلیلہ پر قبضہ کرنے کے بعد برہمنا باد کی طرف بڑھا۔ ان دونوں قلعوں کی فتح اور وہاں مسلمان فوجیوں کے قیام کے بعد راجستھان اور "کچھ" سے جے سنگھ کو کمک ملنے کا راستہ مسدود ہو گیا۔ برہمنا باد پہنچتے ہی محمد بن قاسم نے جے سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو اسلام قبول کرنے یا جزیہ ادا کرنے کی دعوت دی۔ مجاہدین نے حجاج بن یوسف کی ہدایت کے مطابق اپنے لشکر کے گرد خندق کھود لی اور محصورین کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ ہر روز چالیس ہزار سندھی قلعے سے باہر نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کرتے اور شام ہوتے ہی قلعے میں داخل ہو جاتے۔ مسلمان بھی تھک ہار کر اپنے کیمپ میں واپس چلے جاتے۔ یہ سلسلہ کوئی چھ ماہ تک جاری رہا۔[100] اس قدر طویل جنگ اور محاصرے سے جے سنگھ اور اس کے ساتھی تنگ آ گئے اور وہ ایک روز موقع پا کر جیسلمیر (رل) کے بھٹی حکمران کے پاس پہنچ گیا۔ اس موقع پر اس کے والد کا مشیر اور دیرینہ ساتھی محمد بن حارث علافی اپنے ساتھیوں سمیت کشمیر کی جانب روانہ ہو گیا۔[101] ان دونوں کی برہمنا باد سے روانگی کے بعد محصورین کی ہمت جواب دے گئی۔

جے سنگھ کے فرار کے بعد برہمنا باد کے چند سمجھدار تاجر صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ محمد بن قاسم زود یا بدیر شہر فتح کر لے گا اور اس صورت میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہو گا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ اس سے امان طلب کریں اور شہر اس کے حوالے کر دیں۔ اس صورت میں وہ فوجیوں کو تو ٹھکانے لگا دے گا لیکن عام شہری محفوظ و مامون رہیں گے۔[102] چنانچہ انہوں نے محمد بن قاسم کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور اگلے روز وہ عام لشکریوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے کو نکلے اور شام کو اس انداز سے پسپا ہوئے کہ مسلمان انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے برہمنا باد کے شہریوں کی درخواست پر انہیں امان دے دی۔ اس موقع پر بیٹ کے حکمران اور محمد بن قاسم کے مشیر موکہ نے اس سے کہا کہ اب سندھ پر اس کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ کیونکہ جو شخص برہمنا باد پر قابض ہوتا ہے، وہی پورے سندھ کا حکمران مانا جاتا ہے۔[103]

محمد بن قاسم کا اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک مثالی تھا۔ وہ برہمنوں کی بڑی تکریم کرتا تھا۔ اس نے مذہبی معاملے میں کبھی کسی غیر مسلم پر جبر نہیں کیا۔ انہیں منادر تعمیر کرنے اور اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ سندھ میں بدھ مت کے پیروؤں کو یہ سہولت راجہ داہر کے زمانے میں بھی حاصل نہ تھی۔ اس لئے وہ محمد بن قاسم کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے ساتھ تعاون کرنے لگے۔ محمد بن قاسم کے ایماء پر برہمنوں نے مہاتوں میں جا کر لوگوں کو سمجھایا کہ راجہ داہر تو مارا گیا ہے اور اب سندھ عربوں کے قبضے میں ہے۔ اس لئے وہ شورش اور سرکشی ختم کر کے ان کی اطاعت قبول کرلیں [۱۵۴]

برہمنا باد کی فتح اور سندھ کے انتظامی امور سے فارغ ہوتے ہی محمد بن قاسم نے پچاس ہزار مجاہدین کے ساتھ ملتان کا رخ کیا۔ راستے میں اس نے اسکلندہ (موجودہ اُچہ) فتح کیا اور عتبہ بن سلمہ تمیمی کو وہاں کا قلعدار مقرر کیا [۱۵۵] بلاذری لکھتا ہے کہ ملتان جاتے ہوئے محمد بن قاسم نے دریائے بیاس عبور کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک بیاس نے اپنا رُخ تبدیل نہیں کیا تھا۔

ملتان اس زمانے میں ہندوؤں کا ایک اہم تیرتھ تھا۔ وہاں سورج دیوتا کا مندر تھا جس کی یاترا کے لئے دُور دُور سے عقیدتمند ملتان آتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے یہ شہر ان دنوں سندھ کی عملداری میں تھا اور وہاں راجہ داہر کا چچا زاد بھائی گوڑ سنگھ گورنر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ محمد بن قاسم نے ملتان پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا جو دو ماہ تک جاری رہا [۱۵۶] اس دوران میں مسلمانوں کے لشکر میں غلّے کی شدید قِلّت پیدا ہو گئی۔ ایک رُوز ایک شخص چھپتے چھپاتے قلعے سے باہر نکلا اور اس نے محمد بن قاسم سے اپنی لئے امان طلب کی۔ امان ملنے پر اس نے بتایا کہ ملتان کے شہری پینے کے لئے دریا کا پانی استعمال کرتے ہیں جو ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے شہر میں آتا ہے۔ اگر پانی کی سپلائی منقطع کر دی جائے تو ملتان کے شہری مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیں گے [۱۵۷] محمد بن قاسم نے اس شخص کی نشاندہی پر پانی کا راستہ تبدیل کر دیا تو شہریوں نے عاجز آکر شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے۔ اس موقع پر گوڑ سنگھ کشمیر کی جانب فرار ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے سورج دیوتا کے مندر کا معائنہ کیا۔ وہاں چھ ہزار

اری موجود تھے جن کے اخراجات مندر کی آمدنی سے پورے کئے جاتے تھے ۔ فاتحین نے مندر اور اس میں نصب سورج دیوتا کے بت سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اسے جوں کا توں رہنے دیا ۔ مسلمانوں کو مندر کے ایک کمرے سے اس قدر مال و دولت ہاتھ لگا کہ ملتان کا نام ہی " بیت الذھب " یعنی سونے کا گھر پڑ گیا[٨]

محمد بن قاسم نے داؤد بن نصر کو ملتان کا والی مقرر کیا اور گرد و نواح کے علاقوں کی تسخیر کے لئے فوجی افسر مقرر کئے ۔ ابو حکیم شیبانی کو دس ہزار سواروں کے ساتھ کنوج کی طرف روانہ کیا[٩] یہ کنوج اس قنوج سے ، جو راجہ جے چند راٹھور کا پایہ تخت تھا اور جسے سلطان محمد غوری نے فتح کیا تھا ، الگ مقام تھا ۔ کنوج کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مشرقی راجستھان میں ایک سیاسی اور تجارتی مرکز تھا ۔ اسی طرح محمد بن قاسم نے ایک لشکر گجرات و کاٹھیاواڑ کے اہم تجارتی مرکز بھیلمان کی تسخیر کے لئے روانہ کیا ۔ اس زمانے میں بھیلمان گوجر حکمرانوں کا دارالحکومت تھا اور وہاں کے باشندے قزاقی کے لئے بدنام تھے ۔ اسی نواح میں کیرج بھی ایک اہم مقام تھا ۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی تحقیق کے مطابق یہ ان دنوں کیرج کھیڑا کے نام سے موسوم ہے اور یہ صوبہ گجرات کے ایک ضلع کا صدر مقام ہے[١٠] اس کی تسخیر کے لئے بھی ایک مہم بھیجی گئی ۔ انہی دنوں محمد بن قاسم نے دیپالپور کی تسخیر کے لئے خریم کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا اور خود موجودہ اوکاڑہ کی جانب بڑھا ۔ اوکاڑہ سے قریب کشمیر اور سندھ کی سرحد تھی اور اس زمانے میں وہ جگہ " پنج ماہات " کہلاتی تھی ۔ اس جگہ راجہ چچ نے نشانی کے طور پر بڑے بڑے درخت لگوائے تھے[١١] محمد بن قاسم وہاں تک پہنچا اور کشمیر کی سرحد میں داخل ہونے کی بجائے وہیں سے ملتان واپس لوٹ آیا ۔ ملتان میں قیام کے دوران میں اسے حجاج بن یوسف ارتحال کی اطلاع ملی ۔

بد قسمتی سے شوال ۹۵ ھ / جون ۷۱۴ء میں حجاج بن یوسف کا صرف ۵۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا اور محمد بن قاسم اپنے عظیم سرپرست اور مربی سے محروم ہو گیا[١٢] حجاج کی وفات کے صرف آٹھ ماہ بعد فروری ۷۱۵ء / جمادی الثانی ۹۶ ھ میں خلیفہ ولید بھی راہئ ملکِ بقا ہوا اور اس کی جگہ اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن ہوا[١٣] ولید کے بعد سلیمان کی نامزدگی اس کے والد عبدالملک نے کی تھی ۔ ولید

اپنے آخری دورِ حکومت میں اپنے والد کی وصیت کو پسِ پشت ڈال کر اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر چاہتا تھا۔ اس تبدیلی سے متعلق ولید نے حجاج بن یوسف سے مشورہ کیا تو اس نے ولید کی پُرزور حمایت کی۔ اسی بنا پر سلیمان حجاج کا شدید مخالف ہو گیا۔ ولید اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ سلیمان نے تخت نشین ہوتے ہی انتقامی جذبے کے تحت حجاج بن یوسف کے قرابتداروں کے خلاف کارروائی شروع کر دی اور محمد بن قاسم بھی اس کی زد میں آگیا[114]۔ اس نے محمد بن قاسم کو اس کے منصب سے برطرف کرکے اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی دمشقی کو سندھ کا والی مقرر کیا[115]۔ اس نے سلیمان کے حکم سے محمد بن قاسم کو گرفتار کرکے معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں عراق روانہ کیا۔ آلِ مہلب حجاج بن یوسف کے بدترین دشمن تھے۔ اس لئے اثنائے سفر معاویہ بن مہلب نے محمد بن قاسم کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ بنو اُمیہ کے زوال کا ایک سبب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے عظیم محسنوں، قتیبہ بن مُسلم باہلی فاتح وسطِ ایشیاء، موسیٰ بن نُصیر فاتح اُندلس اور محمد بن قاسم فاتح سندھ کے ساتھ وحشیانہ سلوک روا رکھا اور یوں وہ قابل اور مخلص لوگوں کی حمایت سے محروم ہو گئے۔

میر محمد معصوم بھکری نے خدا جانے اس افسانے کو کیونکر تسلیم کر لیا جس میں محمد بن قاسم کے انجام کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے مالِ غنیمت کے ساتھ راجہ داہر کی دو بیٹیاں سُورج دیوی اور پرمل دیوی خلیفہ ولید کی خدمت میں روانہ کیں۔ خلیفہ نے انہیں تربیت دلا کر اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ جب خلیفہ نے انہیں خلوت میں طلب کیا تو انہوں نے اسے بتایا کہ محمد بن قاسم نے تین راتیں انہیں خلوت میں رکھ کر اس کے پاس بھیجا ہے۔ اس پر خلیفہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے محمد بن قاسم کو اس کے عہدے سے برطرف کرکے اسے گائے کی کھال میں سی کر دارالخلافہ بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ گائے کی کھال تین روز بعد خشک ہو گئی تو اس کا دم گھٹ گیا۔ معاویہ بن مہلب نے اس کی نعش صندوق میں بند کرکے ولید کی خدمت میں پہنچائی تو اس نے ان دونوں لڑکیوں کو بلا کر کہا کہ وہ دیکھیں کہ اس کے حکم کی کس طرح تعمیل کی جاتی ہے[116]۔ محمد بن قاسم کی نعش دیکھ کر ان لڑکیوں نے خلیفہ کو

بتایا کہ وہ تو اس بہانے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھیں ۔ اس پر خلیفہ بڑا پشیمان ہوا اور اس نے ان لڑکوں کو زندہ دیوار میں چنوا دیا ۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہیں ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم دیا ۔ ایک اور روائت کے مطابق انہیں گھوڑوں کی دُموں کے ساتھ باندھ کر شہر میں پھرایا اور پھر دجلہ میں پھینک دیا ۔[1]

اس روایت پر چند اعتراضات وارد ہوتے ہیں ۔ اولاً محمد بن قاسم کی برطرفی کا واقعہ ولید کے زمانے میں پیش نہیں آیا بلکہ اس کی وفات کے بعد سلیمان کے عہد میں پیش آیا تھا ۔ میر محمد معصوم بھکری نے خلیفہ ولید کو اس فعلِ شنیع کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے ، جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے ۔ ثانیاً محمد بن قاسم اتنے اُونچے کردار کا مالک تھا کہ اس سے یہ توقع رکھنی ہی خلافِ عقل ہے کہ اس نے ان لڑکیوں کو اپنی خلوت میں رکھ کر خلیفہ کی خدمت میں بھیجا ہو ۔ ثالثاً یہ واقعہ کسی ہم عصر مؤرخ نے نقل نہیں کیا اور کئی صدیاں گزر جانے کے بعد مؤرخوں نے وضع کر لیا ۔ رابعاً دو حقیقی بہنوں کے ساتھ خلوت نہ ہی محمد بن قاسم جیسے بزرگ تابعی کے شرعاً جائز تھی اور نہ ولید جیسے خلیفہ کے لئے ۔ خامساً سورج دیوی اور پرمل دیوی نام کی راجہ داہر کی بیٹیوں کے نام ہم عصر تاریخوں میں نہیں ملتے ۔

محمد بن قاسم نے دیبل کے مفرور قلعدار کی دو بیٹیاں حجاج بن یوسف کی خدمت میں بھیجی تھیں ، داہر کی بیٹیوں کا کہیں ذکر نہیں آیا ۔ سادساً محمد بن قاسم اپنے اعلیٰ حکام کا اس قدر فرمانبردار تھا کہ اس نے راجہ داہر کی بیوہ رانی لاڈی سے نکاح کرنے کے لئے بھی حجاج بن یوسف سے اجازت طلب کی تھی حالانکہ وہ عاقل و بالغ تھا اور اسے رانی لاڈی سے نکاح کرنے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی ۔ رانی لاڈی اس وقت ایک کنیز تھی جو دوسرے قیدیوں کی طرح بیت المال کی مِلک تھی ۔ حجاج بن یوسف سے اجازت ملنے کے بعد محمد بن قاسم نے اسے خرید کر آزاد کر دیا اور اسے اپنے نکاح میں لے آیا ۔[2] اس سے یہ توقع کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ بِلا نکاح داہر کی دو بیٹیوں کو اپنی خلوت میں رکھے ۔ ان حقائق کی روشنی میں اس واقعہ کو ، جسے میر محمد معصوم بھکری اور میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے خوب اُچھالا ہے ، ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی ہے ۔

صحیح واقعہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم گجرات کا شہر کیرج فتح کر چکا تھا کہ یہیں اسے اپنی معزولی کا پروانہ موصول ہوا[۱۱۱]۔ کیرج وہی شہر ہے جہاں کے باشندوں نے اس کی معزولی پر ماتم کیا (فبکی اہل السند علی محمد) اور اس کا بت بنا کر یادگار کے طور پر نصب کیا۔ محمد بن قاسم کو معاویہ بن مہلب پابجولان عراق لے گیا۔ (یعقوبی نے اس کا نام حبیب بن المہلب لکھا ہے)۔ حجاج بن یوسف نے واسط میں خطرناک مجرموں کے لئے خاص طور پر ایک قید خانہ تعمیر کروایا تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بقول یاقوت الحموی ایک زمانے میں وہاں ۳۳۰۰۰ قیدی نظر بند تھے۔ محمد بن قاسم کو اسی قید خانے میں رکھا گیا۔ اس قید خانے کے داروغہ صالح بن عبدالرحمٰن کے بھائی آدم بن عبدالرحمٰن کو حجاج بن یوسف نے خارجی ہونے کے جرم میں قتل کروا دیا تھا۔ صالح کو اپنے بھائی کی موت کا بڑا رنج تھا اور وہ آلِ عقیل (حجاج بن یوسف کے قرابتدار) کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے آدم کی موت کا بدلہ لینے کے لئے محمد بن قاسم کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر مار ڈالا[۱۱۲]۔ رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیراً۔

یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عجمی مؤرخوں نے حجاج بن یوسف کو بڑا بدنام کیا ہے۔ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز یہ کہا کرتے تھے کہ وہ قیامت کے روز گذشتہ اُمتوں کے ظالم ترین اشخاص کے مقابلے میں حجاج بن یوسف کو پیش کریں گے تو ظلم و ستم میں حجاج بن یوسف کا پلّہ ہی بھاری رہے گا۔ اس کے ظلم و ستم کے واقعات کو ایرانی مؤرخوں نے نمک مرچ لگا کر پیش کیا ہے۔ اگر اس نے شورہ پست عراقیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تھی تو وہ اس سلوک کے مستحق تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی تو عراقیوں کو اہل النفاق و الشقاق کہا تھا۔ راقم کے خیال میں حجاج بن یوسف کی دو خدمات ایسی ہیں کہ مسلمان اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ اولاً اس نے قرآن حکیم پر اعراب لگوا کر اس کی قرأت ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی۔ ثانیاً اس نے گوادر سے لے کر عمر کوٹ اور رَن آف کچھ سے لے کر اوکاڑہ تک کا علاقہ فتح کر کے "پاکستان" کی بنیاد رکھ دی۔ اس کی یہی دو خدمات اس کی بخشش کے لئے کافی ہیں۔ راقم کے خیال میں پاکستانیوں کو خاص طور پر اپنے عظیم محسن حجاج بن یوسف کا احترام کرنا چاہیے کہ اس نے سندھ کو دارالاسلام بنا کر اسے مسلم اکثریت کا صوبہ بنا دیا۔ اس نے محمد بن قاسم کو جو نصیحتیں لکھ کر بھیجی تھیں وہ اس کی دینداری اور اسلام دوستی پر دال ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیراً۔

محمد بن قاسم کے جانشین

عام طور پر ہمارے مؤرخین محمد بن قاسم کی معزولی اور عراق روانگی کے ساتھ ہی برِّعظیم پاک وہند اور خاص طور پر سندھ کی تاریخ کا روشن باب ختم کرکے الپتگین (م ۹۶۳ء) کے ہاتھوں سلطنتِ غزنہ کا قیام اور پھر سبکتگین (م ۹۹۷ء) کی ہندو شاہی خاندان کے حکمران جے پال کے ساتھ لڑائیوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ محمد بن قاسم کی روانگی کے بعد سندھ میں کیا ہوا۔ وہ اسے بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمان تو سندھ سے نہیں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد دارالخلافہ سے والی مقرر ہو کر یہاں آتے رہے اور ان میں سے بعض نے اپنی دینی حمیّت اور علم دوستی سے سندھ کو صحیح معنوں میں "باب الاسلام" بنا دیا۔ شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (م ۱۹۵۹ء)، سیّد ابو ظفر ندوی (م ۱۹۵۸ء) اور قاضی اطہر مبارکپوری نے والیانِ سندھ کی جو فہرست تیار کی ہے اس میں قدرے اختلاف ہے۔ محمد بن قاسم کے یہاں سے جانے کے بعد مندرجہ ذیل والی سندھ کا نظم ونسق چلاتے رہے۔

1 ۔ یزید بن ابی کبشہ جبرئیل السکسکی دمشقی، محمد بن قاسم کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ بڑا علم دوست شخص اور بلند پایہ مُحدّث تھا۔ اسے حضرت ابُوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ اور عالم صحابی کی صحبت میسّر آئی تھی۔ خود اس سے کئی نامور محدّثین نے حدیثوں کی روایت کی ہے۔ اِمام بخاری کی صحیح، اِمام محمد الشیبانیؒ کی کتاب الآثار اور امام حاکم نیشا پوری کی المستدرک میں یزید بن ابی کبشہ کی مرویات موجود ہیں[1]۔ بدقسمتی سے یزید سندھ آنے کے ۱۸ روز بعد فوت ہو گیا اور اس سے اہلِ سندھ کماحقہٗ فائدہ نہ اُٹھا سکے[2]۔

2 ۔ یزید بن ابی کبشہ کی اچانک وفات کے بعد اس کے بھائی عبید اللہ بن ابی کبشہ نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی[3] لیکن اسے جلد ہی آلِ عقیل (خانوادۂ حجاج بن یوسف) کے ایک جانی دشمن صالح بن عبدالرحمٰن نے مسندِ اقتدار سے الگ کر دیا۔

3 ۔ عبید اللہ بن ابی کبشہ کی برطرفی کے بعد عمران بن النعمان نے اقتدار سنبھالا[4] لیکن

اسے بھی جلد ہی اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور اس کی جگہ دربار خلافت سے آلِ عقیل کا سخت ترین دشمن حبیب بن المہلب بن ابی صفرہ اَزدی کا تقرر بطورِ والی سندھ ہوا ۔ سیّد ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ یزید بن ابی کبشہ کی وفات اور حبیب بن المہلب کی تقرری کے درمیانی عرصے میں عامر بن عبداللہ بھی چند روز کے لئے اقتدار پر قابض ہو گیا تھا[5]

3 ۔ جب حبیب بن المہلب سندھ پہنچا تو اس وقت وہاں کے حالات بڑے خراب ہو چکے تھے ۔ عرب فاتحین چھاؤنیوں میں پناہ لئے ہوئے تھے اور سندھ سے فرار ہونے والے ہندو جاگیردار واپس آکر اپنی جاگیروں پر قابض ہو چکے تھے ۔ راجہ داہر کا فرزند جے سنگھ برہمناباد پر اپنا تسلّط جمانے میں کامیاب ہو چکا تھا ۔ سندھ میں مقیم عربوں اور نو مسلموں کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا ۔ حبیب بن المہلب کی کوشش سے اروڑ کے باشندوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور پھر اس نے چھاؤنیوں میں مقیم مجاہدوں کا حوصلہ بڑھایا ۔ حبیب بن المہلب اپنی تدبیر اور جرأت سے جے سنگھ اور ہندو جاگیرداروں کو سندھ سے بھگانے میں کامیاب ہو گیا[6] اسی زمانے میں خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے جانشین عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۹ / ۷۱۷ء) میں حبیب بن المہلب کو خیانت کے جرم میں اس کے عہدے سے برطرف کر دیا ۔

5 ۔ حبیب بن المہلب کی معزولی کے بعد عمرو بن مُسلم باہلی سندھ کا والی مقرر ہوا ۔ وہ فاتح ماوراء النہر قتیبہ بن مُسلم باہلی کا بھائی تھا ۔ اس کے پیشرو حبیب بن المہلب نے سندھ میں امن و امان قائم کر دیا تھا اس لئے عمرو بن مسلم کی توجہ فتوحات کی جانب لگی رہی ۔ اس نے "کچھ" کے علاقے میں پیشقدمی کرکے کئی اہم قصبات سندھ میں شامل کر لئے[7]

6 ۔ عمرو بن مُسلم باہلی کے بعد ایک مختصر سے عرصے کے لئے فلان سیبیؒ سندھ کا والی مقرر ہوا ۔ قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں کہ خلیفہ بن خیاط شباب بصری (م ۲۴۰ ھ / ۸۵۴ء) کے علاوہ اور کسی مؤرخ نے اس کا ذکر نہیں کیا[8]

7 ۔ خلیفہ یزید بن عبدالملک (م ۷۲۴ء) کے دورِ حکومت میں ترکستان کے معزول والی یزید بن المہلب نے بغاوت کر دی اور کئی مشرقی ممالک پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے اپنے ایک معتمد ساتھی وداع بن حمید ازدی کو سندھ کا والی مقرر کیا تاکہ وہ سندھ جاکر اپنی

پوزیشن مضبوط بنائے اور اگر یزید بن المہلب کو دوسرے علاقوں میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ سندھ جا کر پناہ لے سکے[9]

8 ۔ ۱۰۳ھ / ۷۲۱ء میں یزید بن عبدالملک کے عہد میں عراق کے حاکم ابنِ ہبیرہ نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے عبید اللہ بن علی سلمی کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ اس نے سندھ میں اس قدر خاموشی کے ساتھ اپنا وقت گذارا کہ بعض مؤرخوں کو اس کے تقرر کا علم بھی نہ ہو سکا[10]

9 ۔ عبید اللہ بن علی سلمی کو ابنِ ہبیرہ نے جلد ہی اقتدار سے الگ کر کے اس کی جگہ عبدالحمید بن عبدالرحمٰن مری کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ وہ ۱۰۴ھ / ۷۲۲ء تا ۱۰۵ھ / ۷۲۴ء سندھ میں مقیم رہا[11]

10 ۔ عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کے بعد اس کا بھائی جنید بن عبدالرحمٰن مری سندھ کا والی مقرر ہوا۔ اس کا شمار سندھ کے باصلاحیت اور قابل ترین والیوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ سندھ پہنچا تو راجہ داہر کے فرزند جے سنگھ نے، جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی دعوت پر مسلمان ہو چکا تھا، اس کی مخالفت کی اور سندھ پر حکومت کرنے کا اپنا حق جتایا۔ اس پر طرفین میں اس قدر کشیدگی بڑھ گئی کہ جنگ تک نوبت پہنچی۔ جے سنگھ شکست کھا کر بھاگا لیکن جنید کے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ جے سنگھ پر ارتداد کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد جنید نے اسے قتل کرا دیا۔ جنید نے بحیرۂ عرب کے ساحل سے لے کر دریائے راوی تک امن قائم کیا اور اس کے بعد راجستھان اور گجرات کے کی جانب پیشقدمی کی۔ اس نے مارواڑ، بھیلمان اور کیرج فتح کر لئے اور گجرات کے گوجر حکمرانوں کے دارالحکومت پنجا سرپر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۱۱ھ / ۷۲۹ء میں جنید خراسان کا والی بن کر سندھ سے رخصت ہوا[12]

11 ۔ جنید بن عبدالرحمٰن کی جگہ تمیم بن زید العتبی کا تقرر ہوا۔ وہ محمد بن قاسم کے ساتھیوں میں سے تھا اور اسی زمانے سے سندھ میں مقیم تھا۔ وہ فطرتاً بڑا سست و کاہل تھا۔ اس لئے اس کے عہد میں بدامنی شروع ہو گئی اور حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ اس نے عراق کی جانب فرار ہی میں اپنی عافیت جانی[13]

12 ۔ تمیم بن زید کے فرار کے بعد حکم بن عوانہ الکلبی سندھ کا والی بن کر آیا[14] وہ اپنے

ساتھ عراق سے فاتح سندھ محمد بن قاسم کے فرزند عمرو کو بھی ساتھ لیتے آیا ۔ وہ سندھ آنے سے قبل خراسان میں والی کے فرائض انجام دے چکا تھا اس تجربے کے باوجود وہ بحیثیتِ منتظم ناکام رہا ۔ مؤرخین نے اس پر بھی سستی اور نااہلی کا الزام لگایا ہے ۔ بلاذری لکھتے ہیں کہ جب حکم بن عوانہ سندھ پہنچا تو " کچھ " کے علاقے کے علاوہ پورے سندھ میں کفر کا دور دورہ تھا ۔ مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی ۔ ان حالات میں حکم نے سندھ اور کچھ کی سرحد پر محفوظہ کے نام سے ایک شہر بسایا اور کچھ عرصے بعد برہمنا باد سے قریب منصورہ آباد کیا ۔ حکم بن عوانہ ۱۲۱ ھ / ۷۳۹ء میں باغیوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا ۔[۱۵]

13 ۔ حکم بن عوانہ کی جگہ عمرو بن محمد بن قاسم کا تقرر ہوا ۔ اس کی ذات میں اپنے عظیم باپ کے تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے ۔ اس نے امن و امان قائم رکھنے کے لئے فوج تیار کی اور ملک کو باغیوں سے پاک کیا ۔ اس کا شمار سندھ کے قابل ترین والیوں میں ہوتا ہے ۔ پانچ سال سندھ کا والی رہنے کے بعد عمرو بن محمد ۱۲۵ ھ / ۷۴۳ء میں اپنے عہدے سے معزول ہوا ۔[۱۶]

14 ۔ عمرو بن محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن عرار سندھ کا والی بن کر آیا ۔ وہ ایک اچھا فوجی افسر تھا لیکن سیاست کے نشیب و فراز سے واقف نہ تھا ۔ اس نے باغیوں کو اطاعت پر مجبور کیا اور سندھ کے نظم و نسق کو درست کیا ۔ اسے تاریخ میں اچھے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اسے منصور بن جمہور نامی ایک متغلب نے گرفتار کر کے دیوار میں چنوا دیا ۔[۱۷]

15 ۔ منصور بن جمہور الکلبی ، یزید بن عرار کا قرابتدار تھا ۔ اس نے اُموی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور شکست کھا کر سندھ کی جانب فرار ہوا ۔ یزید بن عرار کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے منصور کو خط لکھا کہ وہ ادھر کا رُخ نہ کرے ۔ منصور نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور سندھ پہنچ گیا ۔ یزید اور منصور کے مابین جنگ ہوئی جس میں اوّل الذکر کو شکست ہوئی اور وہ منصورہ میں محصور ہو گیا ۔[۱۸] جب محاصرے نے طول پکڑا تو یزید نے صلح کی درخواست کی جو منصور نے رد کر دی ۔ منصورہ پر قبضہ کرنے کے بعد جمہور نے یزید کو زندہ دیوار میں چنوا دیا ۔ منصور ہی کے زمانے میں اُموی حکومت کا

خاتمہ ہوا اور بنو عباس کی خلافت قائم ہوئی۔

16۔ ابوالعباس السفاح عباسی (م ۷۵۴ء) کے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے فوراً بعد ابو مُسلم خراسانی نے ہر علاقے میں اپنے کارندے بھیجے۔ اس نے مغلس بن السری العبدی کو سندھ پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس وقت دیبل کا حکمران منصور بن جمہور کا بھائی منظور تھا۔ اس نے مغلس کی آمد پر مزاحمت کی اور نوبت جنگ تک پہنچی جس میں منظور مارا گیا۔ منصور کو اپنے بھائی کی موت کا بڑا صدمہ ہوا اور وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ مغلس کے مقابلے کو نکلا۔ منصور کے مقابلے میں مغلس کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر منصور کے ہاتھوں قتل ہوا۔[19]

17۔ ابو مُسلم خراسانی کو مغلس کی شکست اور موت کی اطلاع ملی تو وہ بڑا برافروختہ ہوا۔ اس نے موسیٰ بن کعب تمیمی کو سندھ روانہ کیا۔[20] اس نے قنداییل میں قیام کر کے سندھ کے حالات معلوم کئے۔ اس موقع پر اس نے بڑے تدبّر کا ثبوت دیا اور سندھ میں مقیم اپنے ہم قبیلہ افراد کو خط لکھ کر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ سندھ پہنچنے کے بعد موسیٰ اور منصور کے مابین جنگ ہوئی جس میں منصور کو شکست ہوئی اور وہ راجستھان کی جانب فرار ہو گیا۔ موسیٰ کے سپاہیوں نے اس کا تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ موسیٰ نے ۱۳۴ھ / ۷۵۱ء میں اسے قتل کروا دیا۔[21]

موسیٰ بن کعب نے منصورہ کو آباد کرنے پر خصوصی توجہ دی اور جامع مسجد کی توسیع کرائی۔ وہ ۱۴۰ھ / ۷۵۷ء میں رخصت لے کر بغداد گیا اور تھوڑے ہی عرصے بعد وہیں انتقال کر گیا۔

18۔ موسیٰ بن کعب سندھ سے بغداد روانہ ہوتے وقت اپنے فرزند عیینہ کو اپنا قائم مقام بنا گیا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اسے ہی سندھ کا والی بنا دیا گیا لیکن وہ اپنے عظیم والد کے اعلیٰ اوصاف سے عاری تھا۔ اس کے عہد میں بدنظمی بڑھ گئی اور عربوں کے دو بڑے گروہ قحطانی اور ربیعہ بھی اس کی مخالفت پر تُل گئے۔ عیینہ حالات پر قابو پانے میں ناکام رہا تو اس نے قحطانی اور ربیعہ گروہوں کے بہت سے افراد قتل کروا دیے۔ اس پر پورے صوبے میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔[22]

19۔ ان حالات میں خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی (م ۷۷۵ء) نے عیینہ کو معزول کر کے

اس کی جگہ عمر بن حفص بن عثمان کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ وہ اپنی جرأت اور شجاعت کی بنا پر "ہزار مرد" کے لقب سے ملقب تھا۔ خلیفہ نے اس کے ساتھ ایک مدبّر عقبہ بن مسلم کو بھی سندھ بھیجا۔ عمر بن حفص ۱۴۱ ھ / ۷۵۸ء میں سندھ پہنچا تو عوام عیینہ کا ساتھ چھوڑ کر عمر بن حفص کے ساتھ مل گئے۔ ان حالات میں عیینہ نے نئے والی سے امان طلب کی۔ اس نے عیینہ کو گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دیا۔ سفر کے دوران وہ موقع پا کر فرار ہو گیا۔ جب وہ بجستان کے شہر رخج پہنچا تو یمنی عربوں نے اسے پکڑ کر قتل کر ڈالا[۲۴]

عمر بن حفص نے سندھ میں امن و امان قائم کیا۔ اس کا شمار سندھ کے لائق و فائق والیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے عہد میں عبداللہ الاشتر علوی سندھ آیا۔ وہ یہاں عباسیوں کے مقابلے میں سیّدوں کے لئے زمین ہموار کرنے لگا۔ عمر بن حفص اس سے آگاہ نہ تھا۔ اس کی بیوی نے بغداد سے اسے خط لکھا کہ وہ حکومت کا باغی ہے اور اس کے دو ساتھی یہاں مارے گئے ہیں۔ اس لئے احتیاط کی ضرورت ہے۔ عمر بن حفص نے وقتی طور پر یہ فتنہ دبا دیا لیکن عبداللہ کے خلاف کوئی سخت قدم نہ اٹھایا۔اسی بنا پر منصور عباسی اس سے کبیدہ خاطر ہو گیا اور ۱۵۱ ھ / ۷۶۸ء میں اس کا تبادلہ سندھ سے افریقہ کر دیا[۲۵]

20 - عمر بن حفص کی جگہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے ہشام بن عمر تغلبی کا تقرر کیا[۲۵] خلیفہ نے اسے عبداللہ الاشتر علوی کو ہر قیمت پر گرفتار کرنے کی تاکید کی۔ ہشام درپردہ سادات کا طرفدار تھا اس لئے سندھ پہنچنے کے بعد وہ بڑا متردد ہوا۔ عبداللہ نے ایک ہندو راجے کی ریاست میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اتفاق سے ایک روز ہشام کا بھائی سفیح ایک فوجی دستہ لے کر کہیں بغاوت فرو کرنے جا رہا تھا۔ ادھر عبداللہ اپنے نو ساتھیوں کے ہمراہ شکار کے لئے نکلے۔ طرفین ایک دوسرے سے ناواقف تھے اس لئے ان میں مقابلہ ہو گیا جس میں عبداللہ اور ان کے نو ساتھی مارے گئے[۲۶] ان کے جسم زخموں سے اس قدر چور ہو گئے کہ ان کی میتوں کی شناخت بھی نہ ہو سکی۔ سفیح نے اس واقعہ کی اطلاع ہشام کو کر دی اور اس نے خلیفہ کو عبداللہ کے انجام سے مطلع کر دیا۔ منصور نے ہشام کو حکم دیا کہ وہ اس ریاست پر فوراً چڑھائی کر دے جس کے راجہ نے عبداللہ

کو پناہ دی تھی ۔ ہشام نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی اور راجہ کو شکست دے کر اس کی ریاست کو سندھ کی اسلامی ریاست میں شامل کر لیا۔

ہشام کے ایک فوجی سردار نے بحری بیڑا لے کر بھڑوچ سے قریب باربد (بھاڑ بھوت) پر حملہ کیا ۔ وہاں کے مقامی تاجروں سے عربوں کو بہت سی شکایات تھیں اور یہ مقام بحری قزاقوں کی آماجگاہ تھا ۔ ان کی بھی گوشمالی کی گئ ۔ ہشام نے کشمیر کی طرف پیشقدمی کی اور اس کی سرحد میں داخل ہو گیا ۔ قندابیل کے حاکم نے سرکشی اختیار کی تو اس کے خلاف فوجکشی کر کے اسے شکست دی ۔ ہشام نے گجرات کے ایک شہر گندھار پر قبضہ کر کے وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی ۔ خلیفہ اس کے حسنِ انتظام سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے کرمان کا صوبہ بھی اس کے ماتحت کر دیا ۔ ہشام کا دورِ امارت خوشحالی اور امن و امان کے لئے مشہور ہے ۔ ۱۵۷ھ / ۷۷۴ء میں ہشام رخصت لے کر وطن روانہ ہوا اور بغداد پہنچنے کے جلد بعد اس کا انتقال ہو گیا[27]

21 ۔ ہشام بغداد روانہ ہونے سے قبل اپنے بھائی بسطام بن عمرو کو اپنا قائم مقام کر گیا تھا ۔ ہشام کی وفات تک وہ اس کی نیابت کے فرائض انجام دیتا رہا[28]

22 ۔ ہشام کی وفات کے بعد خلیفہ منصور نے معبد بن خلیل تمیمی کو سندھ کا والی مقرر کیا ۔ اس نے سندھ کے داخلی مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی اور اپنے زیرِ اثر علاقے میں امن قائم کیا ۔ اس لئے وہ عوام میں بڑا مقبول ہوا ۔ ۱۵۸ / ۷۷۵ء میں خلیفہ ابوُ جعفر منصور فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا فرزند المہدی تخت نشین ہوا ۔ اس کے ایک سال بعد ۱۵۹ / ۷۷۶ء میں معبد بن خلیل بھی راہئ ملکِ بقا ہوا[29]

23 ۔ خلیفہ المہدی (م ۷۸۶ء) نے معبد بن خلیل کی وفات کے بعد روح بن حاتم المہلبی کو سندھ کی امارت سونپی[30] اس کے دورِ امارت میں خلیفہ نے سندھ کے با اثر غیر مسلموں اور سرحدی ریاستوں کے ہندو راجاؤں کے نام خط لکھے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ۔ خلیفہ کی دعوت پر کئ راجے مشرف باسلام ہوئے ۔ ۱۵۹ھ / ۷۷۶ء میں خلیفہ کے حکم پر والی سندھ نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو ایک بحری بیڑے کا امیر بنا کر ساحلِ گجرات کی جانب روانہ کیا ۔ عربوں کو باربد کے حکام سے بہت سی شکایات تھیں ۔ اس لئے ان کی گوشمالی ضروری سمجھی گئ ۔ اس مہم میں مشہور تابعی اور شہرۂ آفاق

محدّث ابُو حفص ربیعؒ بن صبیح بصریؒ بھی شریک تھے۔ انہیں حضرت امام حسن بصریؒ سے شرفِ تلمّذ تھا۔ ان کا انتقال اسی مہم کے دوران ہوا اور ان کا جسدِ خاکی گجرات کے ساحل سے قریب کسی جزیرے میں سپردِ خاک کیا گیا۔[۲۱]

24 ۔ رُوح بن حاتم کے عہدِ امارت میں جاٹوں نے سندھ میں شورش برپا کی اور نظامِ حکومت درہم برہم کر ڈالا۔ اس پر خلیفۂ المہدی نے بسطام بن عمرو کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ وہ بڑا تجربہ کار شخص تھا اور اپنے بھائی ہشام بن عمرو کی نیابت کے فرائض انجام دے چکا تھا۔ اس بار اسے زیادہ عرصہ کام کرنے کا موقع نہ ملا۔

25 ۔ ۱۶۱ ھ / ۷۷۸ء میں خلیفۂ المہدی نے بسطام بن عمرو کو معزول کر کے اس کی جگہ دوبارہ رُوح بن حاتم کو سندھ کی امارت سونپی لیکن اس بار بھی وہ انتظامِ حکومت چلانے میں ناکام رہا۔

26 ۔ اسی سال دربارِ خلافت سے نصر بن محمد بن اشعث خزاعی سندھ کا والی بن کر آیا لیکن چند ماہ بعد وہ ایک درباری سازش کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے معزول ہوا۔[۲۲]

27 ۔ نصر بن محمد کے بعد خلیفۂ المہدی کی نظرِ انتخاب محمد بن سلیمان بن علی ہاشمی پر پڑی اور سندھ کی امارت اسے تفویض ہوئی۔ اس نے عراق سے باہر جانا پسند نہ کیا اور عبدالملک بن شہاب مسمعی کو، جو سندھ میں رہ چکا تھا اور وہاں کے حالات سے بخوبی آگاہ تھا، اپنا نائب بنا کر سندھ بھیج دیا۔ اسے سندھ آئے ہوئے ابھی تین ہفتے ہی گذرے تھے کہ اسے دربارِ خلافت سے پروانۂ معزولی مل گیا۔[۲۳]

28 ۔ سندھ کا سابق والی نصر بن محمد بن اشعث خزاعی اپنے منصب سے معزول ہو کر سندھ سے عراق جا رہا تھا کہ اسے اثنائے سفر دوبارہ پروانۂ تقرر مل گیا۔ اس نے سندھ پہنچ کر اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھالی لیکن چند روز بعد وہ دوبارہ کسی درباری سازش کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے معزول ہوا۔[۲۴]

29 ۔ نصر بن محمد کے بعد سندھ کی امارت کا قرعۂ فال حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے پڑپوتے زبیر بن عباس بن قثم کے نام نکلا۔[۲۵] موصوف خانہ نشین بزرگ تھے اس لئے سندھ آنے کے بعد بھی وہ زیادہ وقت اپنے گھر میں ہی گزارتے تھے۔ ان حالات میں سندھ میں بدامنی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ جب سندھ سے تشویشناک خبریں بغداد پہنچنے

لگیں تو خلیفہ المہدی نے اپنے ہم جدّ زبیر بن عباس کو اس کی ذمہ داری سے سبکدوش کرکے سطیع بن عمرو تغلبی کو سندھ کا والی مقرر کیا۔

30 ۔ سطیع بن عمرو کے دو بھائی ہشام بن عمرو اور بسطام بن عمرو سندھ پر حکومت کر چکے تھے اس لئے سطیع کے ساتھ بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں ۔ بدقسمتی سے اس کے دورِ امارت میں سندھ میں آباد یمنی اور حجازی عربوں میں نزاع پیدا ہو گئی اور حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ سطیع کو اپنے منصب سے ہاتھ دھونا پڑے ۔

31 ۔ اس بار قرعۂ فال پھر نصر بن محمد بن اشعث کے نام نکلا ۔ وہ سندھ کے حالات سے بخوبی آگاہ تھا اور یہاں کچھ وقت گزار چکا تھا ۔ وہ ۱۶۳ھ / ۷۸۰ء تک سندھ پر حکومت کرتا رہا ۔

اسی زمانے میں خلیفہ المہدی نے اپنے ایک غلام لیث بن طریف کو سندھ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا ۔ اس زمانے میں سندھ میں بدامنی کا دور دورہ تھا ۔ جاٹوں نے مقامی حکام کا ناک میں دم کر رکھا تھا ۔ لیث نے جاٹوں کو راہ راست پر لانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی ۔ اس کی درخواست پر خلیفہ نے اس کی مدد کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی ۔ اس فوج کے سندھ پہنچتے ہی لیث نے " مارشل لا " نافذ کر دیا اور جس شخص نے سر اٹھایا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ ان حالات میں بہت سے باغی سندھ سے فرار ہو گئے اور جو سندھ میں رہ گئے ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی ۔ لیث کے اس اقدام سے سندھ میں مکمل امن قائم ہو گیا۔

اسی زمانے میں ۱۶۹ھ / ۷۸۵ء میں خلیفہ المہدی راہئ ملکِ بقا ہوا ۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ہادی (م ۷۸۶ء) تخت پر بیٹھا ۔ تخت نشینی کے جلد بعد اس کی اپنی والدہ خیزران کے ساتھ اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی ۔ اس لئے وہ امورِ سلطنت کی طرف کماحقہ، توجہ نہ دے سکا ۔ سوا سال تک برائے نام خلیفہ رہنے کے بعد ہادی انتقال کر گیا اور اس کی جگہ اس کا لائق و فائق بھائی ہارون الرشید (م ۸۰۹ء) تختِ خلافت پر متمکن ہوا ۔ ہارون الرشید نے تخت نشین ہوتے ہی ملکی انتظام کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ۔

32 ۔ لیث بن طریف کے فوجی اقدام سے سندھ میں امن قائم ہو چکا تھا اس لئے اب

فوجی گورنر کی بجائے سول گورنر کی ضرورت تھی۔ ہارون الرشید نے بڑے غور و فکر کے بعد سالم یونسی کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ اس نے چار سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ صوبے کا نظم و نسق چلایا۔[٣٨]

33 ۔ سالم یونسی کے بعد ۱۷۴ھ / ۷۹۰ء میں اسحٰق بن سلیمان ہاشمی سندھ کا والی مقرر ہوا۔[٣٩] وہ بڑا نیک دل انسان تھا۔ بدقسمتی سے وہ سندھ پہنچنے کے چند ماہ بعد ہی فوت ہو گیا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا یوسف قائم مقام والی مقرر ہوا۔

34 ۔ جب ہارون الرشید کو اسحٰق بن سلیمان کی وفات کی اطلاع ملی تو اس نے طیفور بن عبداللہ بن منصور الحمیری کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ اس کے عہدِ امارت میں حجازی اور یمنی عربوں میں دوبارہ نزاع پیدا ہو گئی۔ طیفور خود یمنی عرب تھا اس لئے اس کا جھکاؤ یمنیوں کی طرف تھا۔ اسی بنا پر حجازی گروہ اس کے خلاف ہو گیا۔ جب ہارون الرشید کو سندھ کی صورت حال کی اطلاع ملی تو اس نے طیفور کو معزول کر دیا۔[٤٠]

35 ۔ طیفور کی برطرفی کے بعد دربارِ خلافت سے جابر بن اشعث طائی کا تقرر بطورِ والی ہوا۔ ہارون الرشید نے سندھ کے علاوہ مکران بھی اس کی تحویل میں دے دیا۔[٤١] وہ بڑی اچھی شہرت کا حامل تھا اس کے باوجود وہ انتظام حکومت چلانے میں ناکام رہا۔ اسی بناء پر وہ اپنے عہدے سے معزول ہوا۔

36 ۔ جابر بن اشعث کی برطرفی کے بعد ہارون الرشید نے سعید بن سلم بن قتیبہ کو سندھ کی امارت سونپی۔ وہ خود تو عراق ہی میں رہا اور اپنے بھائی کثیر بن سلم کو اپنا نائب بنا کر سندھ بھیج دیا۔ وہ بڑا نا اہل اور بداخلاق حاکم ثابت ہوا۔ اس کے دورِ امارت میں انتظامِ حکومت درہم برہم ہو گیا۔ جب اس کی نااہلی اور بداخلاقی کی خبریں بغداد پہنچنے لگیں تو ہارون الرشید نے اسے معزول کر دیا۔[٤٢]

37 ۔ اس بار ہارون الرشید کی نظر اپنے ایک قریبی عزیز عیسیٰ بن جعفر بن منصور عباسی پر پڑی۔ عیسیٰ بھی سعید بن سلم کی طرح عراق ہی میں رہا اور محمد بن عدی ثعلبی کو اپنا نائب بنا کر سندھ روانہ کر دیا۔[٤٣] محمد بن عدی کے دورِ نیابت میں سندھ میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جب اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوا تو وہ منصورہ سے ملتان چلا گیا۔ اہلِ ملتان نے اس کا راستہ روکا۔ اس پر طرفین میں لڑائی شروع ہو گئی جس میں

محمد بن عدی کو شکست ہوئی اور وہ جان بچا کر منصورہ کی جانب بھاگ نکلا۔[۳۴]

38 - ہارون الرشید کو سندھ کے حالات اور ملتانیوں کے ہاتھوں محمد بن عدی کی ہزیمت سے آگاہی ہوئی تو اس نے اسے برطرف کرکے اس کی جگہ عبدالرحمٰن کو سندھ کی حکومت کا پروانہ عطاء کیا[۳۵] سندھ آنے کے بعد وہ بھی یمنی اور حجازی عربوں کی خانہ جنگی کو ختم نہ کر سکا۔ اس لئے اسے اپنے عہدے پر برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہ رہا۔

39 - عبدالرحمٰن کی برطرفی کے بعد ہارون الرشید نے ایوب بن جعفر بن سلیمان کو سندھ کا والی مقرر کیا لیکن بد قسمتی سے وہ بھی سندھ میں امن قائم کرنے میں ناکام رہا۔

40 - ایوب کی معزولی کے بعد خلیفہ نے بڑے غور و خوض کے بعد آلِ مہلب میں سے ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص داؤد بن یزید بن حاتم المہلبی کا انتخاب کیا اور اسے ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء میں سندھ کی حکومت عطاء کی[۳۶] داؤد بن یزید نے اپنی جگہ اپنے بھائی مغیرہ کو اپنا قائم مقام بنا کر سندھ بھیجا۔ مغیرہ کے سندھ پہنچنے تک وہاں آباد عربوں نے خانہ جنگی ختم کرنے کے لئے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس منصوبہ کے مطابق ایک علاقہ قریش کے لئے مختص کر دیا اور دوسرا حصہ حجازی عربوں کے حوالے کرنا تھا اور تیسرا حصہ یمنیوں کے پاس رہنا تھا۔

جب مغیرہ منصورہ پہنچا تو وہاں کے باشندوں نے اسے شہر میں داخل نہ ہونے دیا اور اسے یہ کہلا بھیجا کہ وہ ان کے تیار کردہ منصوبے پر عمل کرے۔ مغیرہ نے ان کا مطالبہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا[۳۷] منصورہ کے باشندوں نے تنگ آ کر اس کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ ان کے ساتھ تعصب نہ برتا جائے اور جب مغیرہ شہر کے ایک دروازے سے داخل ہو تو عرب باشندے دوسرے دروازے سے شہر سے باہر نکل جائیں گے۔ مغیرہ نے ان کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ اس پر طرفین میں جنگ چھڑ گئی جس میں مغیرہ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

جب سندھ کے اصل والی داؤد بن یزید کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ بڑے فوجی ساز و سامان کے ساتھ عراق سے سندھ روانہ ہوا۔ وہ حجازی عربوں کا شدید مخالف تھا۔ سندھ میں داخل ہونے کے بعد اسے جو بھی حجازی ملا، اس نے اسے سخت سزا دی۔ اس لئے سندھ میں آباد حجازی اسے اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ جب وہ منصورہ پہنچا تو

حجازیوں نے اسے شہر میں داخل ہونے سے روکا۔ اس پر طرفین میں جنگ چھڑ گئی جو کئی ماہ تک جاری رہی۔ اس جنگ میں حجازیوں کو شکست ہوئی اور داؤد بن یزید سندھ میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔[۴۸]

داؤد بن یزید بیس سال تک سندھ کا والی رہا اور اس نے ملک کی ترقی کے لئے بڑا کام کیا۔ اس کی کوشش اور ہمت سے چند ہی سالوں میں پورا علاقہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔ اس کے دور امارت میں عراق اور سندھ کے درمیان آمد و رفت میں اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں سندھ اور ہندوستان سے کنکہ (گنگا)، صنجہل (جھجو ؟)، شاناق (چانکیہ)، جودر (جدھڑ ؟)، صالح بن بہلہ (بھلہ ؟) اور منکہ (مہنگا ؟) جیسے نامور وید بغداد میں جا بسے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" کا ایک باب ان کے لئے مختص کیا ہے جس میں دل کھول کر ان کے کمالِ فن کی داد دی ہے۔ مؤخر الذکر وید منکہ، ہارون الرشید کا ذاتی معالج مقرر ہوا۔ وہ بیت الحکمت میں فنِ طب پر سنسکرت زبان میں لکھی گئی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے میں مدد دیا کرتا تھا۔[۴۹]

۱۹۳ھ / ۸۰۹ء میں ہارون الرشید فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا امین الرشید تخت نشین ہوا اور اس کی اپنے بھائی مامون الرشید کے ساتھ چپقلش شروع ہو گئی اس لئے وہ سندھ کی جانب توجہ نہ دے سکا۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ کی تحقیق کے مطابق امین الرشید کے عہدِ حکومت میں بشیر بن داؤد سندھ کا نظم و نسق چلاتا رہا۔[۵۰] سید ابوظفر ندوی کی یہ رائے ہے کہ امین الرشید کے عہدِ خلافت میں داؤد بن یزید ہی سندھ کا والی تھا اور جب مامون الرشید کے زمانے میں ۲۰۵ھ / ۸۲۰ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا بشر سندھ کا مدار المہام بنا۔[۵۱] کچھ عرصے تک تو وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا پھر اس نے سرکشی اختیار کی اور دربارِ خلافت کو خراج کی ادائیگی روک لی۔ اس پر مامون الرشید نے ۲۱۲ھ / ۸۲۷ء میں بشر کی جگہ حاجب بن صالح کو فوج دے کر سندھ روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ بشر سے بقایا جات وصول کر کے سندھ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ان دنوں بشر کا بھائی مکران کا حاکم تھا۔ اس نے حاجب بن صالح کو سندھ جانے روک دیا۔[۵۲]

42 ۔ ان حالات میں مامون الرشید (م ۸۳۳ء) نے ایک سمجھدار اور دلیر شخص غسان بن عباد مہلبی کو سندھ کا والی مقرر کرنے کا عزم ظاہر کیا ۔ اس پر اس کے ایک مشیر نے یہ مشورہ دیا کہ غسان کی بجائے اس کے بھائی محمد بن عباد کو بشر کی بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا جائے اور غسان کو اس کے ساتھ سندھ بھیج دیا جائے ۔ مامون نے ان سے یہ کہا کہ وہ بشر کو گرفتار کرکے بغداد لے آئیں اور سندھ کے حالات درست کرکے وہاں کا نظم و نسق موسیٰ بن یحییٰ برمکی کے سپرد کر دیں[۵۳] یہ دونوں بھائی ۲۱۳ ھ / ۸۲۸ء میں منصورہ پہنچے تو بشر نے بلا مزاحمت حکومت ان کے حوالے کر دی ۔

43 ۔ سندھ کا انتظام درست کرنے کے بعد غسان اور عباد نے موسیٰ بن یحییٰ برمکی کو وہاں چھوڑا اور خود بشر کو ساتھ لے کر بغداد روانہ ہو گئے ۔ موسیٰ کی ایک ہندو راجے کے ساتھ لڑائی ہوئی جس میں راجہ شکست کھا کر گرفتار ہوا اور موسیٰ نے اسے قتل کرا دیا ۔ اسی زمانے میں ساحلِ گجرات پر سندان کی مسلم ریاست کا نیم خود مختار حاکم محمد بن فضل بن ماہان سترّ جنگی جہاز لے کر قزاقوں کی گوشمالی کے لئے سندان سے چلا[۵۴] اس نے گجرات کے ساحل پر قزاقوں کے تمام مراکز برباد کر ڈالے اور جنوبی ہند کی ساحلی ریاستوں کے ہندو حکمرانوں کے دلوں پر اپنی بہادری کی دھاک بٹھا دی ۔[۵۵]

44 ۔ سات سال تک سندھ پر حکومت کرنے کے بعد ۲۲۱ ھ / ۸۳۶ء میں موسیٰ بن یحییٰ برمکی فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا عمران سندھ کا والی مقرر ہوا ۔ اس نے سندھ میں امن قائم رکھنے کی ہر ممکن سعی کی ۔ ایک بار جاٹوں نے سرکشی اختیار کی تو عمران نے ان کی بغاوت کو دبائے رکھنے کی غرض سے ان کے علاقے میں ایک مستقل فوجی چھاؤنی قائم کر دی ۔ اس کے عہد میں بہت سی فتوحات ہوئی ۔ عمران بڑی کامیابی کے ساتھ سندھ پر حکومت کرنے کے بعد ۲۲۶ ھ / ۸۴۱ء میں حجازی عربوں کے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری کے ہاتھوں مارا گیا ۔[۵۶]

45 ۔ عمران کی جگہ دربارِ خلافت سے بقول ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ترک سردار ایتاخ کا تقرر بطورِ والی سندھ ہوا ۔ اپنی فوجی ذمہ داریوں کی بنا پر وہ خود تو دارالخلافہ ہی میں رہا اور عنبسہ بن اسحٰق ضبی کو اپنا نائب بنا کر سندھ بھیج دیا[۵۷] اس نے سندھ آتے ہی باغی سرداروں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا اور جنہوں نے اس کی اطاعت قبول

کرنے میں پس و پیش سے کام لیا ان کے خلاف فوجکشی کی۔ اس نے نو سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ سندھ پر حکومت کی اور اس پورے عرصے میں باغیوں کو دبائے رکھا[۵۸]

۲۳۲ھ / ۸۴۷ء میں خلیفہ واثق باللہ فوت ہوا تو اس کی جگہ المتوکل تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے اپنے پیشرو خلیفہ کے مقرر کردہ تمام عمال معزول کر دیئے۔ امیر ایتاخ بھی زیر عتاب آیا۔ جب عنبسہ کو اپنے مربّی کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو بڑا گھبرایا اور بلا اجازت سندھ سے عراق روانہ ہو گیا۔

46 ۔ جب المتوکل کو یہ اطلاع ملی کہ عنبسہ اپنا عہدہ چھوڑ کر آ رہا ہے تو اس نے فوراً ہارون بن ابی خالد کو سندھ کا والی مقرر کر دیا[۵۹] وہ ۲۳۵ھ / ۸۵۰ء میں منصورہ پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ حجازی عرب بہت طاقتور ہو چکے ہیں اور ان کا سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری کسی والی یا اس کے کارندوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ عنبسہ بھی جب تک سندھ میں رہا، وہ عمر بن عبدالعزیز سے دبتا رہا۔ ہارون عقل و خرد سے بالکل عاری تھا۔ اس نے اپنے پیشرو کے برعکس حجازیوں کی مخالفت مول لے لی۔ اسی نادانی کی بنا پر وہ ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء میں حجازیوں کے ہاتھوں قتل ہوا[۶۰]

اس زمانے میں ہر جانب سے بغاوت کی خبریں دارالخلافہ پہنچ رہی تھیں۔ مامون الرشید کے زمانے میں ہی نیم خود مختار ریاستوں کی بنیاد پڑنے لگی تھی اور اس کے سپہ سالار طاہر ذُوالیمین نے خراسان میں ۲۰۵ھ / ۸۲۰ء میں طاہری ریاست کی بنیاد رکھ دی تھی[۶۱] اس کے اس اقدام سے باغیوں کو بڑی شہ ملی۔ المتوکل کو ہارون بن ابی خالد کے قتل کی اطلاع ملی اور اس کے ساتھ ہی عمر بن عبدالعزیز ہباری کی درخواست پہنچی کہ اگر اسے سندھ کا والی تسلیم کر لیا جائے تو وہ خلیفہ کا فرمانبرار رہے گا[۶۲] بدلے ہوئے سیاسی حالات میں المتوکل نے اسے ہی غنیمت جانتے ہوئے اسے پروانۂ حکومت عطاء کر دیا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے منصورہ میں ہباری خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔

ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ نے ۲۵۵ھ / ۸۶۹ء میں سندھ میں ابوالصمہ کی ولایت کا ذکر کیا ہے[۶۳] یہاں انہیں سہو ہوا ہے۔ ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء میں ہارون بن ابی خالد کے قتل کے بعد عمر بن عبدالعزیز ہباری کو پروانۂ حکومت مل گیا تھا۔ اس لئے ۲۵۵ھ / ۸۶۹ء میں ابوالصمہ کے والی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں کہ ابُوجعفر منصور (م ۱۵۸ ھ / ۷۷۵ء) کے دورِ خلافت میں جب داوٗد بن یزید بن حاتم سندھ کا والی بن کر آیا تو اس کے " ہمراہ بغاوت کا ایک جرثومہ بھی آیا ۔ اس کا نام ابُوصمہ تھا اور یہ بنو کندہ کا غلام تھا "[۶۴] بلاذری نے بھی داوٗد بن یزید بن حاتم کے بعد ابُوالصمہ " متغلب " (جو طاقت کے بل بُوتے پر اقتدار پر ناجائز طریقے سے قابض ہو جائے) کا ذکر کیا ہے[۶۵]۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ والئ سندھ کی حجازی اور یمنی عربوں کے ساتھ چپقلش میں منصورہ پر کچھ عرصے کے لئے قابض ہو گیا ہو گا ۔ کیونکہ اہلِ منصورہ نے داوٗد بن یزید کے بھائی مغیرہ کو منصورہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور پھر ایک جنگ میں اسے شکست دی ۔ مغیرہ کی شکست کے بعد داوٗد بن یزید خود سندھ آیا ۔ اس دوران میں ابُوالصمہ کا اقتدار سنبھال لینا ممکن ہے ۔

خود مختار حکومتوں کا قیام

مامون الرشید (۸۳۳ ۔ ـــ ۸۱۳ء) کے عہدِ خلافت میں ہی صوبوں پر عباسیوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی ۔ سب سے پہلے اس کے سپہ سالار طاہر ذُوالیمین نے خراسان میں طاہری خاندان کی موروثی حکومت کی بنیاد رکھی ۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور صوبوں میں نیم خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جنھوں نے ہماری سیاسی، مذہبی اور معاشرتی تاریخ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ۔

دولتِ ماہانیہ:

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہدِ خلافت میں بنو سامہ کا ایک اُولوالعزم غلام فضل بن ماہان عمان سے سندھ آیا اور کچھ عرصے بعد وہ گجرات کی جانب چلا گیا ۔ وہاں کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے وہاں اپنی حکومت قائم کرلی اور سندان کو اپنا دارالحکومت قرار دیا[۱] ۔ آج کل اسے سنجان کہتے ہیں اور یہ بمبئی سے جانبِ شمال ۱۴۵ کلو میٹر کے فاصلے پر سُورت جانے والی ریلوے لائن پر بمبئی سے سولھواں ریلوے اسٹیشن ہے ۔ فضل نے سندان میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جہاں مامون الرشید کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا ۔

سندان کے قرب و جوار میں چیمور، سُوپارہ، گندھارا (ضلع بھڑوچ) اور کھنبایت جیسی بستیاں موجود تھیں جو بظاہر ہندوؤں کی عملداری میں تھیں لیکن وہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان آباد تھے[۲] ۔ ابنِ حوقل لکھتا ہے کہ ان بستیوں میں اسلامی احکام چلتے ہیں[۳] ۔ صرف چیمور میں مسلمانوں کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی ۔ ان میں سیراف، بصرہ، عمان اور بغداد کے باشندوں کی اکثریت تھی ۔ وہاں کے متموّل تاجروں میں موسیٰ بن اسحٰق اور ابوسعید معروف بن زکریا سرِ فہرست تھے ۔ ہندو حکمران نے مسلمانوں کے امور ایک مسلمان افسر کو سونپے ہوئے تھے[۴] ۔ ان شہروں کی مساجد

میں عباسی خلفاء کا نام جمعہ کے خطبے میں پڑھا جاتا تھا۔

فضل بن ماہان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد بن فضل تخت نشین ہوا۔ اس نے ستّر جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا اور گجرات کے ساحل سے لے کر سندھ تک بحری قزاقوں کے مراکز کا خاتمہ کر کے بحری سفر کو محفوظ بنایا۔[۵] اس کی بحری مہمات کا دبدبہ جنوبی ہند تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے عہد میں سندان ایک معروف بندرگاہ بن گئی جہاں عدن، حبشہ، سراندیپ، سیراف، بصرہ اور چین سے سامان تجارت سے لدے ہوئے جہاز آنے لگے تھے۔ اس نے بھی عباسی خلیفہ کے ساتھ نیاز مندانہ تعلقات برقرار رکھے اور اپنی حکومت کو عباسی خلیفہ سے تسلیم کروا لیا۔

ماہان بن فضل اس خاندان کا تیسرا اور آخری حکمران تھا۔ وہ محمد بن فضل کا حقیقی بھائی تھا۔ ایک بار محمد بن فضل ایک بحری مہم پر نکلا تو اس کی عدمِ موجودگی میں ماہان نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے عباسی خلیفہ معتصم باللہ (۸۳۳ء۔۸۴۲ء) کے ساتھ تعلقات قائم رکھے اور اس کی خدمت میں ساگوان کا ایک بہت بڑا شہتیر بطورِ تحفہ بھیجا۔[۶] ماہان نے چونکہ اپنے بھائی کی غیر حاضری میں اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اس لئے عوام اسے غاصب سمجھتے تھے اور اس سے ناخوش تھے۔ بدیں وجہ انہوں نے ایک روز موقع پا کر اسے گرفتار کر کے سُولی پر لٹکا دیا۔ ہندوؤں نے اس سیاسی بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقتدار پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی دولتِ ماہانیہ ختم ہو گئی۔ اس موقع پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اتنی رعایت ضرور برتی کہ انہیں مسجد آباد رکھنے کی اجازت دے دی۔[۷]

دولتِ ہباریہ:

حضرت ہبار بن اسود اسدی ہاشمی ایک بہادر اور باہمت صحابی تھے جنہوں نے مکّہ مکرّمہ کی سکونت ترک کر کے مدینہ طیّبہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ کچھ عرصے بعد موصوف نے شام میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد سے منذر بن زبیر حاکمِ سندھ حکم بن عوانہ کلبی کے ساتھ ہشام بن عبدالملک کے عہدِ خلافت میں شام سے سندھ آکر بانیہ میں آباد ہو گیا۔ یہ قصبہ منصورہ سے جانبِ جنوب ایک منزل کے فاصلے پر واقع تھا۔

منذر کا پوتا عمر بن عبدالعزیز بڑا مدبّر اور باہمت انسان تھا۔ ان نے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء میں سندھ پر قبضہ کرکے ہباری خاندان کی بنیاد رکھ دی اور منصورہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا[۸] اس نے عباسی خلیفہ المتوکل (م ۸۶۱ء) سے اپنی حکومت تسلیم کروا لی اور اس کے نام کا خطبہ اپنی مملکت میں جاری کر دیا۔ مسعودی نے اس کے پوتے ابوالمنذر عمر بن عبداللہ کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے[۹]۔ اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ غزنویوں کے ہاتھوں ہوا۔

اس خاندان کے حکمران بڑے دیندار تھے اور وہ امام داؤد ظاہری (م ۲۷۰ھ / ۸۸۴ء) کے پیرو تھے۔ قاضی ابو محمد ظاہری اور ابو العباس احمد بن محمد التمیمی جیسے فضلاء ہباریوں کے دور میں منصورہ میں رہتے تھے اور امام حاکم نیشاپوری جیسا بلند پایہ محدّث مؤخرالذکر عالم کا شاگرد تھا۔ ہباریوں کی دینداری کا اثر ان کی رعایا پر بھی پڑا۔ مقدسی نے اہلِ منصورہ کی اسلام کے ساتھ محبت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے[۱۰]

دولتِ بنو سامہ:

ملتان میں تیسری صدی ہجری کے ربع آخر میں بنو سامہ نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس خاندان کے افراد عمان سے ملتان آئے اور یہاں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس خاندان کا بانی محمد بن قاسم بن منبّہ سامی تھا۔ جب مسعودی ملتان آیا تو اس زمانے میں ابواللہاب المنبّہ بن اسد قریشی وہاں کا حکمران تھا[۱۱] ان کی مملکت کی وسعت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک لاکھ بیس ہزار دیہات شامل تھے۔

بنو سامہ سُنّی المذہب تھے اور ان کی مملکت میں عباسی خلیفے کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس خاندان کے حکمران ملتان سے چند میل کے فاصلے پر جندراوڑ میں رہتے تھے جہاں ان کی فوجی چھاؤنی تھی۔ جمعہ کے روز حاکم ہاتھی پر سوار ہو کر بڑے کرّوفر کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لئے ملتان آیا کرتا تھا[۱۲]

بنو سامہ کی حکومت ایک صدی کے بعد جلم بن شیبان کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ جلم اور اس کے جانشین عقیدۃً اسمٰعیلی تھے اس لئے ان کی مملکت میں مصر کے

فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ مقدسی لکھتا ہے کہ ملتان کی مساجد میں اذان میں " حی علیٰ خیر العمل " کہا جاتا ہے[۱۳]۔ اسمٰعیلی حکمرانوں نے ملتان میں سورج دیوتا کا وہ مندر تباہ کر دیا جسے فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفی اور اس کے جانشینوں نے برقرار رہنے دیا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد شیخ حمید کا مجمل سا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ شیخ حمید کے بعد اس کے فرزند نصر نے بڑا نام پیدا کیا۔ نصر کا جانشین ابُوالفتوح داوٗد ہوا جسے محمود غزنوی نے ۴۰۱ھ / ۱۰۱۰ء میں شکست دی اور ملتان سے باطنی اثرات کو ختم کر ڈالا[۱۴]۔

دولتِ معدانیہ:

اُموی دورِ خلافت کے آغاز میں مہلب بن ابی صفرہ اَزدی نے جب عراق میں خوارج کے خلاف تادیبی اقدامات کئے اور انہیں بصرہ سے نکال باہر کیا تو ان کی کثیر تعداد مسقط اور عمان چلی گئی۔ کچھ عرصے بعد انہیں وہاں سے بھی بیدخل ہونا پڑا اور اس بار وہ مکران جا کر آباد ہو گئے۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں انہی خوارج کے ایک طاقتور امیر عیسیٰ بن معدان نے مکران میں موروثی حکومت کی بنیاد رکھی اور کیز کو اپنا دارالحکومت قرار دیا[۱۵]۔ اس کی وفات کے بعد اس کا فرزند معدان بن عیسیٰ تخت نشین ہوا۔ وہ عباسی خلفاء کے خلاف خروج اور بغاوت کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس نے ۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا عیسیٰ بن معدان اس کا جانشین ہوا۔ اس موقع پر اس کے بھائی ابُوالعساکر حسین نے اس کی مخالفت کی اور سلطان مسعود غزنوی سے فوجی امداد لے کر عیسیٰ بن معدان کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گیا[۱۶]۔ وہ حصولِ تخت کے لئے سلطان مسعود غزنوی کا ممنون تھا، اس لئے اس کا نام جمعہ کے خطبے میں شامل کر دیا[۱۷]۔

ابُوالعساکر حسین بن معدان اس خاندان کا چوتھا حکمران تھا۔ وہ بڑا علم دوست انسان تھا اور غیر ممالک کے اہلِ علم کے ساتھ خط و کتابت رکھتا تھا۔ طب پر اس کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے مصر کے ایک نامور طبیب ابُوالحسن علی بن رضوان کے ساتھ گہرے روابط تھے اور اس نے ابُوالعساکر حسین کی فرمائش پر " عِلۃُ القالبج " کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کرکے اسے بھجوایا تھا[۱۸]۔ اِصطخری لکھتا ہے کہ مکران کے خارجی

حکمران "مہراج" (مہاراج) کہلاتے تھے [19]

۲۷۱ ھ / ۸۷۸ء میں غوریوں نے مکران پر حملہ کر کے دولتِ معدانیہ کا چراغ گل کر دیا۔ خوارج کے ہاں گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر سمجھا جاتا ہے اس لئے تمام مؤرخین کا اس پر اجماع ہے کہ ان کی مملکت میں چوری، زنا اور شراب نوشی جیسے جرائم کلیتہً مفقود ہو گئے تھے۔

نظامِ حکومت

عربوں کے دور حکومت میں سندھ پہلے خلافت اُمویہ اور پھر خلافتِ عباسیہ کا ایک صوبہ رہا۔ خلیفہ اپنی صوابدید سے والی کا تقرر کرتا تھا۔ خلافتِ عباسیہ کے دورِ زوال میں سندان، ملتان، مکران اور منصورہ میں خود مختار موروثی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ وہاں کے حکمرانوں نے اپنی آئینی حیثیت تسلیم کروانے کے لئے دربارِ خلافت کے ساتھ اتنا سا تعلق قائم رکھا کہ وہ خلیفہ کو برائے نام حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ ان کی ریاستوں میں نمازِ جمعہ کے خطبے میں عباسی خلیفہ کے لئے دُعا کی جاتی تھی۔

خلیفہ:

اسلامی قانون کی رُو سے حقیقی حکمران اللہ تبارک و تعالیٰ ہے اور اسے ہی اپنی مخلوق پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم، اللہ کے نائب کی حیثیت سے اس کے عطاء کردہ اختیارات استعمال فرماتے رہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ کہہ کر اپنے نبیؑ کی اطاعت کو عین اپنی ہی اطاعت بتایا ہے[1]۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے ساتھ نبوّت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن امورِ مملکت چلانے کے لئے خلافت قائم ہوئی، فقہاءِ کرام نے قیامِ خلافت کو ضروریاتِ دین میں شمار کیا۔ اِمام ابوالحسن علی الماوردی (م ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء) اور اِمام ابو یعلیٰ (م ۴۵۸ ھ / ۱۰۶۶ء) نے خلیفہ کے تقرر کو فرضِ کفایہ کہا ہے[2]۔

خلیفہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا نائب ہونے کی حیثیت سے وہ تمام اختیارات استعمال کرنے کا مجاز تھا جو آنحضرتؐ کو حاصل تھے۔ وہ بیک وقت اسلامی ریاست کا سربراہ، فوج کا سپہ سالار، قاضی القضاۃ، بیت المال کا نگران اعلیٰ، دارالخلافہ کا میرؔ اور جامع مسجد کا امام ہوتا تھا[3]۔ اس کے فرائض میں حفاظتِ دین، نفاذِ احکامِ شریعت، اقامتِ حدود، دفاعِ مملکت، وصولیٔ زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ و صدقات اور ان کے

مصارف اور دیانتدار افسروں کا تقرر شامل تھا۔ اسے اپنے ماتحت افسروں کے عزل و نصب کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔

سندھ کی فتح کے وقت اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک (م ۹۶ھ / ۷۱۵ء) تختِ خلافت پر متمکن تھا۔ اس لئے وہی سندھ کا اصل حکمران تھا۔ اسی کے نام کا خطبہ اور سِکّہ سندھ میں رائج تھا۔

والی:

اس زمانے میں گورنر "والی" کہلاتا تھا۔ اس کا تقرر خلیفہ اپنی صوابدید سے کرتا تھا اور وہ اسی وقت تک اپنے عہدے پر فائز رہ سکتا تھا جب تک اسے خلیفہ کی خوشنودی حاصل رہتی تھی۔ مدراس کا مشہور اسکالر سیّد عبدالقادر حسینی لکھتا ہے کہ والی صوبے میں خلیفے کا نائب سمجھا جاتا تھا اور وہ خلیفہ کے فرائض مثلاً فوج کی کمان، سول انتظامیہ کی سربراہی، عدلیہ کے امور کی انجام دہی، سرکاری واجبات کی وصولی اور نماز کی امامت کراتا تھا[۲]۔ والی صوبے میں قیامِ امن کا ذمہ دار تھا اس لئے کاروبار حکومت چلانے کے لئے وہ افسر مقرر کرتا تھا اور خلیفے کو ان کے تقرر سے مطلع کر دیتا تھا۔ بسا اوقات خلیفہ خود بھی کسی شخص کو کسی اہم عہدے پر مامور کر کے کسی صوبے میں بھیج دیتا تھا۔ ابنِ بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ سیہون کے خطیب الشیبانی سے ملا۔ اس کے مُورثِ اعلیٰ کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۹ھ / ۷۱۸ء میں وہاں خطیب بنا کر بھیجا تھا۔ الشیبانی نے ابنِ بطوطہ کو اپنے مُورثِ اعلیٰ کا تقرر نامہ بھی دکھایا تھا[۳]۔

امام الماوردی کے نزدیک والی کے فرائض میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت بھی شامل ہے۔ وہ اپنے علاقے سے حاجیوں کے بحفاظت گزرنے کا انتظام کرتا تھا۔ اگر اس کا صوبہ سرحد پر واقع ہوتا تھا تو پھر کفار سے جہاد کرنا، فوج تیار رکھنا اور فوجی مہمات کی نگرانی کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھتا تھا کہ اس کے زیر اثر علاقوں میں دین میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل نہ ہونے پائے[۴]۔

عامل:




۳   ۲

۴




۱۔ ساسانی سکہ جس کے حاشیے پر مسلمانوں نے اپنا ٹھپہ لگا دیا ہے۔
۲-۳۔ واسط کی ٹکسال میں ۹۵ ھ میں ڈھالے گئے ولید اول کے سکے
۴۔ منصورہ کی ٹکسال میں ڈھالے گئے چاندی کے سکے

عاملوں کے تقرر کا جواز سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے ۔ آنحضرتؐ نے مختلف علاقوں اور قبائل میں زکوٰۃ و صدقات کی وصولی کے لئے عامل مقرر کئے تھے ۔ ان میں سے بعض عاملین سیاسی اور فوجی فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے[۷] خلفاء راشدین کے عہد میں عامل صوبہ کے والی یا ناظم کے فرائض بھی ادا کرتا تھا ۔ اس کے لئے دیانتدار اور مالی امور کا ماہر ہونا لازمی تھا ۔

اُموی عہد میں عامل والی کا نائب متصوّر ہوتا تھا ۔ جب مالیات کا شعبہ دوسرے انتظامی اداروں سے الگ کیا گیا تو عامل صرف مالیات کا منصرم بن کر رہ گیا ۔ سیّد عبدالقادر حسینی کی یہ رائے ہے کہ بسا اوقات مالی امور میں اس کے مشورے کو والی کے مشورے پر مقدم کھا جاتا تھا[۸]

عامل کا تقرر کبھی تو والی اپنی صوابدید سے کرتا تھا اور کبھی خلیفہ کسی ماہر امورِ مالیات کو عامل مقرر کرکے کسی صوبے میں بھیج دیتا تھا ۔ عامل کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہ تھا[۹] عامل کا کام زکوٰۃ ، خراج ، عشر ، عشور ، جزیہ اور صدقات کی وصولی تھا ۔ وہ یہ رقوم عوام سے اکٹھی کرکے بیت المال میں جمع کرا دیتا تھا ۔ صوبے کا نظم و نسق چلانے ، سرکاری ملازمین اور فوجیوں کو تنخواہیں دینے اور فوجی مہمات کے مصارف پورے کرنے کے لئے ہر وقت رقم کی ضرورت رہتی تھی اس لئے عامل کا کام بڑی ذمہ داری کا تھا ۔

وزیر :

وزارت کا جواز قرآنِ حکیم سے ملتا ہے ۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرکے حضرت ہارونؑ کو اپنا وزیر مقرر کرایا تھا[۱] امام الماوردی فرماتے ہیں کہ اگر نبوّت میں وزارت جائز ہے تو خلافت میں تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہو گی[۱۱] منصبِ وزارت باقاعدہ طور پر تو عباسی عہد میں قائم ہوا لیکن اس سے قبل وزیر کہلائے بغیر بعض اشخاص وزیر کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عمرؓ ان کے " وزیر " بنے رہے اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ " وزیر " ہی کام کرتے رہے ۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں حضرت عمرو بن

العاصؓ اور عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک کے ادوارِ خلافت میں حجاج بن یوسف اور سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ "وزیر" ہی سمجھے جاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تو اس وقت ابھی دارالخلافے میں باقاعدہ وزیر کا عہدہ قائم نہیں ہوا تھا لیکن سندھ اور ہند کے راجاؤں کے ہاں باقاعدہ وزیر ہوا کرتے تھے۔ اس لئے محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقے کا نظم و نسق چلانے اور غیر مسلم رعایا سے تعلقات بڑھانے کے لئے راجہ داہر کے وزیر "سیاکر" کو اس کے منصب پر برقرار رکھا اور اہم امور میں اس کے صائب مشوروں پر عمل کرنے لگا[12] اس طرح دارالخلافے میں باقاعدہ وزیر نہ ہونے کے باوجود سندھ میں منصبِ وزارت قائم ہو گیا۔

کاتب:

ہر محکمے کا نگران اعلیٰ کاتبِ الدیوان کہلاتا تھا۔ اس کے لئے احساس ذمہ داری کے علاوہ قابلِ اعتماد، عادل اور صاحبِ کفایت ہونا ضروری تھا۔ امام الماوردی فرماتے ہیں کہ عادل سے یہ مراد ہے کہ وہ مالی امور میں دیانتدار اور رعایا کے معاملے میں ایماندار ہو۔ صاحبِ کفایت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے محکمے سے متعلق قوانین سے آگاہ ہو، حقوق کی ادائیگی سے باخبر ہو، اس میں کام کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہو، اپنے ماتحتوں سے کام لینا جانتا ہو، ضرورت پیش آنے پر اپنے ماتحتوں کا محاسبہ کر سکتا ہو، اخراجات اور آمدنی کا حساب رکھ سکتا ہو اور اس میں ظلم و ناانصافی کو مٹانے کی ہمت ہو[13]

کاتب چونکہ اپنے محکمے کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا اس لئے والی بھی اسی کے ذریعے اس کے ماتحتوں سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ نظامِ حکومت چلانے کے لئے کاتب کا عہدہ بڑا اہم سمجھا جاتا تھا۔

دیوان القضاء:

اسلام نے عدل پر بڑا زور دیا ہے بلکہ قیامِ خلافت کا مقصد ہی قیامِ عدل بتایا ہے۔ امام الماوردی فرماتے ہیں کہ قیامِ عدل امورِ خلافت میں شامل ہے[14] نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفاء راشدین سے قاضیوں کا تقرر ثابت ہے۔ اس لئے خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف شہروں اور اہم قصبوں میں قاضی مقرر کرے۔

قاضی کے لئے چند شرائط ہیں۔ وہ مرد ہو، مسلمان ہو، بالغ ہو، آزاد ہو (یعنی غلام نہ ہو)، عادل (یعنی متقی اور پرہیزگار) ہو، بصیر ہو، سمیع ہو اور علومِ شریعت سے کماحقہٗ واقف ہو[۵]

قاضی کا کام محض عدالت میں بیٹھ کر عوام کے جھگڑے چکانا ہی نہیں، اس کے بہت سے فرائض ہیں۔ وہ مستحق شخص کو اس کا حق دلائے اور کسی طاقتور کو کسی کمزور پر ظلم نہ کرنے دے۔ وہ اپنے علاقے کے اوقاف کی نگرانی کرے۔ بیوگان اور یتامیٰ کے نکاحوں میں ولی کے فرائض انجام دے۔ اگر کوئی شخص مرنے سے قبل وصیت کر جائے تو اس پر عمل کرانا قاضی کی ذمہ داری ہے۔ تعزیرات اور حدودِ شریعت کا اجراء، اپنے علاقے میں خطباء، آئمہ، مفتیوں اور محتسبوں کا تقرر، یتیموں، نابالغوں اور کم عقل اشخاص کی جائداد کی نگہداشت، مجہول الملک جائداد کی دیکھ بھال اور گمشدہ اشیاء کی بازیابی کے بعد اصل مالکوں کے آنے تک ان کی حفاظت بھی قاضی کے فرائض میں شامل ہے[۶] امام الماوردی نے اس کی ایک ذمہ داری یہ بھی بتائی ہے کہ وہ لوگوں کو ناجائز تجاوزات کرنے سے روکے اور راستوں میں رکاوٹیں کھڑی نہ کرنے دے[۷]

دیوانُ الجند:

سرکاری محکموں میں یہ سب سے اہم محکمہ تھا کیونکہ اسی پر ملک کے دفاع کا انحصار تھا۔ یہ محکمہ حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کیا تھا۔ ان کے عہد سے قبل بوقتِ ضرورت رضا کار لڑنے کے لئے نکلتے تھے اور انہیں مالِ غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے باقاعدہ تنخواہ دار اور باوردی فوج قائم کی اور ان کے حسنِ انتظام کی وجہ سے اسلامی فوج کے ہاتھوں اس زمانے کی سب سے طاقتور حکومتیں، ایران کی ساسانی حکومت اور رُوم کی بازنطینی حکومت صفحۂ ہستی سے حرفِ باطل کی طرح مِٹ گئیں۔

خلافت راشدہ کے خاتمے پر جب اُموی خلافت قائم ہوئی تو انہوں نے

فوج کی طرف خصوصی توجہ دی ۔یوں بھی عہد جاہلیت میں شہری مملکتِ مکہ میں فوج کا انتظام اور میدانِ کار زار میں فوج کی قیادت بنو اُمیہ کے ہاتھ میں تھی[۵] اس قبیلے کے افراد نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں شام و فلسطین کی فتوحات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔جب خلافت ان کے ہاتھ آئی تو انہوں نے فوجی امور پر بڑا زور دیا ۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں سپین ، ماوراء النہر اور سندھ فتح ہوئے ۔ یہ فنِ حرب میں ان کی مہارت کا نتیجہ تھا ۔

اُموی اور عباسی عہد میں ہر صوبے کا والی صوبائی فوج کا سربراہ بھی ہوتا تھا[۶] اس لئے وہ بنفسِ نفیس دیوان الجند کا نگران ہوتا تھا اور اس محکمے کا دیوان اس کا نائب سمجھا جاتا تھا ۔ فوج سے متعلق تمام امور کی نگرانی دیوان الجند سے متعلق تھی ۔ فوجیوں کو تنخواہوں کی ادائیگی ، ان کی جملہ ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری ، فوجی گھوڑوں کی پرورش اور تربیت ، بار برداری کے لئے اُونٹوں کی فراہمی ، اسلحہ کی تیاری اور ترسیل ، سامانِ رسد کی فراہمی ، لشکر کی تربیت اور جہاد کی تیاری اسی محکمے سے متعلق تھی۔

دیوانُ الخراج :

اس محکمے کا تعلق مالی امور سے تھا اور اس کا سربراہ صاحبُ الخراج کہلاتا تھا[۷] اس کے ذمے سرکاری واجبات کی وصولی تھا ۔ عامل مقامی طور پر زکوٰۃ ، عشر ، خراج جزیہ ، عشور اور صدقات جمع کر کے صاحب الخراج کو بھجواتے تھے ۔ اگر یہ واجبات حکومت کا کام چلانے کے لئے ناکافی ہوا کرتے تھے تو پھر ان کے علاوہ عوام سے نائبہ (جمع نوائب) اور ضریبہ (جمع ضرائب) کے نام سے مزید ٹیکس وصول کئے جاتے تھے ۔ نائبہ وہ ٹیکس ہوتا تھا جو آفاتِ سماوی کے نقصانات کی تلافی کے لئے عوام سے لیا جاتا تھا اور ضریبہ اس ٹیکس کو کہتے تھے جو کسی خاص فوجی مہم کے اخراجات پُورے کرنے ، نہریں کھودنے یا پل تعمیر کرنے کی غرض سے عوام سے وصول کیا جاتا تھا[۸]

بیتُ المال :

سرکاری خزانہ بیت المال کہلاتا تھا ۔ اس کا قیام بھی حضرت عمر فاروقؓ

کے زمانے میں عمل میں آیا تھا ۔ زکوٰۃ ، خراج ، عشر ، عشور ، جزیہ ، فَیٔ ، خُمس اور صدقات بیت المال میں جمع کئے جاتے تھے[۲۲] مختلف مَدّوں سے ہونے والی آمدنی کے مصارف چونکہ مختلف تھے ۔ اس لئے ان کا الگ الگ حساب رکھا جاتا تھا تاکہ ان کا مصرف شریعت کے احکام کے مطابق ہو[۲۳] مستحقین کو بیت المال سے ہی وظائف دیئے جاتے تھے ۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اور فوجی مصارف بھی بیت المال سے پورے کئے جاتے تھے ۔ ناگہانی آفات اور قحط سالی کے مواقع پر بیت المال سے ہی امدادی رقوم مستحقین میں بانٹی جاتی تھیں ۔ بیت المال کو مسلمانوں کی مِلک سمجھا جاتا تھا اور اس کی آمدنی پر بھی بقول امام الماوردی مسلمانوں کا ہی حق تھا ۔ ان کے خیال میں بیت المال میں جمع شدہ اموال مسلمانوں کے مفاد کے لئے ہی خرچ کئے جانے چاہئیں[۲۴] ۔ سیّد عبدالقادر حسینی کے خیال میں محمد بن قاسم کے زمانے میں سندھ کے محاصل سے ساٹھ لاکھ درہم سالانہ بیت المال میں جمع ہوا کرتے تھے[۲۵]

بیت المال کے نگران کے لئے دیانتدار ہونا لازمی شرط تھی ۔ ایک بار یمن کے صاحب بیت المال وھب بن منبّہ سے ایک دینار گم ہو گیا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا کہ وہ اپنی گرہ سے یہ نقصان پورا کریں[۲۶] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سال ختم ہونے پر بیت المال کا باقاعدہ آڈٹ ہوتا تھا ۔

دیوانُ الاحداث:

پولیس کا محکمہ دیوان الاحداث کہلاتا تھا اور اس کے افسر اعلیٰ کو صاحبُ الشرطہ کہتے تھے ۔ عہدِ رسالت اور خلافتِ صدیقیؓ میں اس محکمے کا کوئی وجود نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں جرائم مفقود ہو گئے تھے ۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ معدلت میں متعدد ملک فتح ہوئے ، تو وہاں کے عوام کو ، جو اسلامی تعلیمات سے ناآشنا تھے ، جرائم سے باز رکھنے کے لئے دیوان الاحداث قائم کیا گیا ۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ہی صفوان بن اُمیہ کا گھر خرید کر اسے قید خانے میں تبدیل کیا جہاں خطرناک مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔

اُموی عہد میں جب فتوحات کا دَور دَورہ ہوا تو اس محکمے کو بھی وسعت دی گئی ۔ حجاج بن یوسف نے واسط میں سنٹرل جیل تعمیر کروائی جہاں خطرناک مجرموں

اور حکومت کے باغیوں کو رکھا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کو بھی اپنے عہدے سے معزولی کے بعد اسی قید خانے میں رکھا گیا تھا[۲۷]۔ حجاج نے ایک رجسٹر تیار کرایا تھا جس میں کوفہ کے مشتبہ افراد کے نام اور حلیے درج کئے گئے تھے۔ یہ نظام سندھ میں بھی رائج تھا۔ عباسی خلیفہ المعتصم کے عہد میں سندھ کے والی عنبسہ بن اسحٰق الضبی نے دیبل کے شکستہ مندر کو جیل خانے میں تبدیل کر دیا جہاں خطرناک مجرموں اور باغیوں کو رکھا جاتا تھا[۲۸]۔

دیوانُ الرسائل:

اس محکمے کو دیوان البرید بھی کہتے تھے۔ سرکاری ڈاک کی ترسیل اسی محکمے سے متعلق تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈاک چوکیاں قائم تھیں جہاں ہر وقت چاق و چوبند ہرکارے اور تازہ دم گھوڑے تیار کھڑے رہتے تھے۔ ان کا کام سرکاری ڈاک کو ایک چوکی سے دوسری چوکی تک پہنچانا ہوتا تھا۔ اس محکمے کی مستعدی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حجاج بن یوسف کا خط ساتویں روز سندھ میں محمد بن قاسم کو مل جاتا تھا اور اتنے ہی روز میں محمد بن قاسم کا خط حجاج بن یوسف کو بصرہ میں وصول ہو جاتا تھا۔ فتحنامہ سندھ کے ایک اندراج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب جعونہ منجنیقی نے مندر کا کلس گرانے کے لئے شرط بدی تو محمد بن قاسم نے وہ شرط حجاج بن یوسف کو لکھ بھیجی۔ محمد بن قاسم کا خط حجاج بن یوسف تک پہنچنے اور اس کا جواب وصول ہونے میں صرف نو دن لگے تھے[۲۹]۔ ایک بار محمد بن قاسم کو فوجیوں کے استعمال کے لئے سرکے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے حجاج بن یوسف سے فوری طور پر سرکہ بھیجنے کی استدعا کی۔ اس نے سرکے کو رُوئی میں بھگو کر رُوئی سائے میں خشک کی اور پھر ڈاک کے ذریعے محمد بن قاسم کو بھجوا دی[۳۰]۔

دیوانُ الخاتم:

یہ محکمہ حضرت امیر معاویہؓ نے قائم کیا تھا۔ اسے موجودہ زمانے کے ریکارڈ آفس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس محکمے میں تمام اہم کاغذات کی نقول رکھی جاتی تھیں اور سرکاری کاغذات پر مُہر ثبت کر کے اسے متعلقہ محکمے کو بھیجا جاتا تھا[۳۱]۔

دارالضرب:

اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے تک مسلمانوں کا اپنا کوئی سکّہ نہ تھا۔ اسلامی ممالک میں ساسانی اور رُومی سِکّے چلتے تھے۔ اُموی عہد کے آغاز میں خراسان اور عراق کے والیوں نے ساسانی سکوں کے حاشیوں پر للہ، برکت یا بسم اللہ کا ٹھپہ لگوا دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ، عبید اللہ بن زیاد، مصعب بن زبیرؓ اور قطری بن الفجاۃ کے ایسے سِکّے بعض عجائب گھروں اور راقم الحروف کے ذخیرۂ مسکوکات میں موجود ہیں۔ امام الماوردی لکھتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے مسلمانوں کے اپنے سِکّوں کی ضرورت محسوس کی اور اس نے عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں واسط میں دارالضرب قائم کیا اور وہاں درہم مضروب کرائے[۲۲] اس زمانے میں درہم کا وزن چھ دانق ہوتا تھا اور دس درہم ایک مثقال کے برابر ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی سِکّے کو خراب کرتا یا اس سے چاندی کھرچ لیتا تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ حضرت ابان بن امیر المومنین عثمانؓ کسی شہر کے حاکم تھے۔ وہاں ایک شخص سِکّے کو خراب کرتے ہوئے پکڑا گیا تو انہوں نے مجرم کو تیس کوڑے لگانے کا حکم دیا[۲۳] اسی طرح کھوٹے سکّے بنانے والوں کے لئے بھی سزا مقرر تھی۔

خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں حجاج بن یوسف نے واسط کی ٹکسال میں جو درہم مضروب کرائے ان کے ایک رُخ پر یہ عبارت منقوش تھی:

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ

اس کلمۂ شہادت کو یہ عبارت گھیرے ہوئے تھی۔

ضرب ہذا الدرہم بواسط فی سنۃ ستۃ و سبعین

اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ کفواً احد

اس عبارت کو یہ الفاظ گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔

محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون[۲۴] جب محمد بن قاسم نے ولید بن عبدالملک کے عہدِ حکومت میں سندھ فتح کیا تو واسط کی ٹکسال یہاں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی تھی

اس لئے اس نے سندھ میں دارالضرب قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی ۔ بعد ازاں بڑھتی ہوئی مقامی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے منصورہ میں دارالضرب قائم ہوا ۔ راقم کے ذاتی مجموعہ مسکوکات میں منصورہ میں ۲۵۰ ھ / ۸۶۴ء کے مضروب سکّے موجود ہیں ۔ کراچی کے قومی عجائب گھر میں ان سکوں کے سانچے بھی محفوظ ہیں جو منصورہ میں کھدائی کے دوران ملے ہیں ۔

شہرۂ آفاق جغرافیہ دان اور سیّاح ابنِ حوقل نے چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے وسط میں بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی تھی ۔ جب وہ سندھ آیا تو اس وقت وہاں جو سکّے مروج تھے وہ " قندھاریات " کہلاتے تھے[35] ۔ احسن التقاسیم کا فاضل مُصنّف مقدسی ، جو ۳۹۱ ھ / ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ فوت ہوا ، لکھتا ہے کہ سندھ میں جو سکّے رائج ہیں ، وہ " قندھاریات " کے نام سے موسوم ہیں[36] ۔ مشہور جغرافیہ دان اِصطخری ، ابنِ حوقل کا ہمعصر ہے اور ۳۴۰ ھ / ۹۵۱ء میں ان کی ملاقات بھی ثابت ہے ۔ اِصطخری لکھتا ہے کہ سندھ میں جو سکّے چلتے ہیں ، وہ " قاہریات " کہلاتے ہیں لیکن درہم کو عرفِ عام میں " طاطری " (جمع طاطریات) کہتے ہیں[37] ۔ نامور مؤرخ یعقوبی (م ۲۸۴ ھ / ۸۹۷ء) کی ایک تحریر سے اِصطخری کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے[38] ۔ موجودہ دور کے بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ سندھ میں مروج سکّے قاہرہ کے سکّوں سے ملتے جلتے تھے ، اس لئے وہ قاہریات کے نام سے موسوم ہو گئے ۔

راقم کے خیال میں ابنِ حوقل ، اِصطخری ، مقدسی اور یعقوبی کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے ۔ لوگوں نے مختلف سکّوں کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے جیسے ہمارے ہاں کبھی پائیاں ، پیسے ، ٹکے ، آنے ، دونیاں ، چونیاں ، اَٹھنیاں اور رُوپے چلتے تھے ۔ اسی طرح سندھ میں مروج مختلف سکّوں کے مختلف نام تھے ۔

تہذیبی اثرات

محمد بن قاسم اسلامی فنِ تعمیر کا بڑا ستھرا ذوق رکھتا تھا اور اس نے فارس کی گورنری کے زمانے میں شیراز میں عربی طرزِ تعمیر کو متعارف کرایا تھا[1] سندھ آنے کے بعد اس نے مالِ غنیمت کا خمس نو مفتوحہ قصبوں اور شہروں میں مسجدیں تعمیر کرنے کے لئے مختص کر دیا[2] سندھ کی فتح کے بعد حکام اور امرأ نے سندھ میں نئے شہر آباد کرنے میں خاصی دلچسپی لی۔ منصورہ اور محفوظہ اسی زمانے میں آباد ہوئے۔ ان امراء نے جب اپنے لئے مکانات بنوائے تو عربی طرزِ تعمیر اپنایا۔ اسی طرح جب سندھی اور ہندی مسلمان کوفہ، بصرہ، بوقا، انطاکیہ اور کسکر میں آباد ہوئے تو انہوں نے اپنے محلّوں اور گلیوں کے نام سندھی اور ہندی طرز پر رکھے اور ان شہروں میں سندھی اور ہندی طرزِ تعمیر کو فروغ دیا[3]

کاٹھیاواڑ اور گجرات میں اگرچہ ہندوؤں کی حکومت تھی لیکن وہاں کے حکمران کا مسلمانوں کے ساتھ سلوک بہت اچھا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کی عملداری میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان آباد تھے۔ تمام تر غیر ملکی تجارت ان کے ہاتھوں میں تھی اور وہ بڑے خوشحال تھے۔ ان آباد کاروں نے بھیلمان، سوپارہ، بھڑوچ، گندھارا، چیمور سندان اور کھنبایت جیسے شہروں میں مساجد تعمیر کر لی تھیں جہاں جمعہ کے دن خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ گجرات کے ہندو حکمران نے مسلمانوں کے امور ایک مسلمان افسر کے سپرد کر دیئے تھے جو "ہنرمن" کہلاتا تھا[4] ان آباد کاروں کی وجہ سے گجرات میں اسلامی فنِ تعمیر اور اسلامی روایات کو فروغ حاصل ہوا۔

ابنِ حوقل اور مسعودی جیسے سیّاح، جنہوں نے چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس علاقے کی سیاحت کی، اس پر شاہد ہیں کہ منصورہ کے متموّل لوگ عراقیوں جیسا لباس استعمال کرتے تھے اور ان کے ہاں قمیص بڑی مقبول تھی۔ تجارت پیشہ لوگ بھی قمیص پسند کرتے تھے[5] عوام کے برعکس منصورہ

کے حکمران ہندوستانی راجوں جیسا لباس پہنتے تھے ۔ مکران کے معدانی خانوادے کے حکمران ہندو راجوں کی دیکھا دیکھی خود کو مہاراج کہلوانا پسند کرتے تھے ۔ مکران میں مردوں میں کان چھیدوانے کا بھی رواج تھا [6]

سندھ میں ایک خاص قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا جسے " سُندس " کہتے تھے۔ اس کا ذکر قرآنِ حکیم میں بھی ہوا ہے ۔ یہ کپڑا برآمد کیا جاتا تھا ۔ اسی طرح سندھ کی مسلم ریاست کی سرحد پر ہندوؤں کے علاقے میں سندان میں بہت عمدہ کپڑا تیار ہوتا تھا ۔ وہاں کے بنے ہوئے آزار بند بھی سندھ اور عرب ممالک میں بڑے مقبول تھے [7]

یہاں کی چیزوں میں سے جو عربوں کو پسند آئیں اور جنہیں انہوں نے بلاتکلّف اپنی تہذیب میں داخل کر لیا ان میں عبادی ٹوپی بھی تھی ۔ جو عباد بن زیادہ کی طرف منسوب ہے ۔ یہ صاحب ۵۳ ھ / ۶۷۳ء میں سجستان سے گجرات پہنچے تو انہیں اونچی ٹوپی پسند آ گئی ۔ عباد نے اس طرز کی ٹوپیاں تیار کروائیں اور استعمال کرنے لگے ۔ یہ ٹوپی ان کے نام کی مناسبت سے عبادی ٹوپی مشہور ہو گئی [8]

سندھ میں کھنبائتی جوتے بڑے مقبول تھے ۔ یہ بڑی نفیس قسم کے جوتے تھے اور چلتے وقت آواز نکالتے تھے ۔ ابتدائی زمانے میں یہ جوتے ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، کھنبایت میں تیار ہوتے تھے ، پھر منصورہ اس صنعت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ ان جوتوں پر " النعال الکنبائتیہ " کی مُہر لگائی جاتی تھی ۔ جب سندھ اور عراق و شام کے درمیان آمد و رفت عام ہو گئی تو کھنبائتی طرز کے جوتے وہاں بھی مقبول ہو گئے ۔ مقدسی (م ۳۹۱ ھ / ۱۰۰۰ء) لکھتا ہے کہ منصورہ سے یہ جوتے بڑی تعداد میں عراق و شام بھیجے جاتے تھے [9]

سندھ کے اہم شہروں اور خصوصاً ملتان میں ہاتھی دانت پر بڑا عمدہ کام ہوتا تھا اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے تھے ۔ ملتان کا وہ بازار جہاں ہاتھی دانت کا کاروبار ہوتا تھا " سوق العاجیین " کے نام سے موسوم تھا ۔ جس بازار میں ٹھٹھیرے برتن بناتے اور فروخت کرتے تھے ، وہ " سوق الصفارین " کہلاتا تھا [10] یہاں تیار ہونے والی اشیاء کی عرب ممالک میں بڑی مانگ تھی اور اُموی اور پھر عباسی خلفاء ان چیزوں کو بہت پسند کرتے تھے ۔

سندھ میں ایک خاص طرز کے آتش دان تیار کیے جاتے تھے جو عرب ملکوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اسی طرح لوبان اور عود جلانے والی انگیٹھیاں عرب ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں۔ ایسی ہی ہندی ساخت کی ایک انگیٹھی کا ذکر محمد بن عبداللہ نمیری ثقفی نے اپنے اشعار میں کیا ہے[1]

سندھ میں تیار ہونے والا خضاب بڑی مقدار میں عرب ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اسے استعمال کرنے سے سال بھر بال سیاہ رہتے تھے۔ خلیفہ ہشام بن عبدالملک یہی خضاب لگایا کرتا تھا[2]

عربوں نے سندھ میں سرکہ متعارف کرایا۔ محمد بن قاسم نے فرمائش کرکے حجاج بن یوسف سے سرکہ منگوایا تھا۔ بعد میں سندھ میں بھی سرکہ بننے لگا لیکن عرب سیاح ابنِ حوقل کے بقول وہ بہت زیادہ تُرش تھا[3]۔ عرب میں لیموں اور آم نہیں ہوتے تھے۔ ان کے پودے سندھ سے عرب ممالک لے جا کر لگائے گئے لیکن آم کے پودوں کو وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔

عربوں کی وجہ سے سندھ میں کھجور مقبول ہوئی۔ مجاہدین کو راشن میں کھجوریں ملا کرتی تھیں۔ وہ کھجوریں کھانے کے بعد گٹھلیاں پھینک دیتے تھے، جو کچھ عرصے بعد اُگ آتی تھیں۔ ملتان اور رُوہڑی کے نواح میں جہاں عربوں نے کیمپ لگائے، وہاں آج بھی کھجوروں کے گھنے نخلستان پائے جاتے ہیں۔ راجہ داہر کے دارالحکومت الور سے قریب محمد بن قاسم نے رُوہڑی میں دریا کے کنارے کیمپ لگایا تو وہاں بڑا وسیع و عریض نخلستان وجود میں آگیا جو خیرپور تک پھیلا ہوا ہے۔ عربوں کے عہدِ حکومت میں سندھ میں ایسی عمدہ قسم کی کھجوریں پیدا ہونے لگیں کہ وہ عراق کی کھجوروں پر بھی سبقت لے گئیں۔ ابنِ ابی حاتم الرازی (م ۳۲۸ / ۹۴۰ء) لکھتے ہیں کہ ابواسحٰق ابراہیم بن مالک البزاز نامی ایک بزرگ سندھ سے کھجوروں کے پودے عراق برآمد کیا کرتے تھے[4]۔ حال ہی میں جنابِ محترم حکیم محمد سعید صاحب دہلوی نے مدینۃ الحکمت کراچی میں خود رَو کھجور کے پیڑوں کا لیبارٹری میں تجزیہ کرایا تو ماہرینِ نباتات نے یہ رپورٹ بھیجی کہ ان پیڑوں کے اجداد عرب نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

خضدار، جو اب قلات ڈویژن کا صدر مقام ہے، مختلف اوقات میں قزدار

اور قصدار کے ناموں سے بھی موسوم رہا ہے۔ یہ مقام شیریں اور لطیف قسم کے انگوروں کی وجہ سے مشہور تھا۔ ان انگوروں کا ذکر عربی اشعار میں بھی آیا ہے[۱۵]

۴۵ھ / ۶۶۵ء میں فاتح قیقان (اسے کیکان بھی لکھتے ہیں) عبداللہ بن سوار العبدی نے چند قیقانی گھوڑے حضرت امیر معاویہؓ (م ۶۸۰ء) کی خدمت میں بھیجے[۱۶] یہ گھوڑے طویل القامت، خوبصورت اور سُبک رفتار تھے۔ اسی طرح سندھی گھوڑے عرب ممالک میں بڑی قیمت پاتے تھے۔ خلیفہ ولید بن یزید بن عبدالملک (م ۷۴۴ء) کے پاس ایک سندھی گھوڑا تھا، جو گھڑ دوڑ میں اوّل آیا تھا[۱۷]

محمد بن قاسم نے سندھ سے کئی ہزار بھینسیں حجاج بن یوسف کی خدمت میں روانہ کیں۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک (م ۷۱۵ء) نے چار ہزار سندھی نسل کی بھینسیں انطاکیہ اور مصیصہ کے درمیان واقع جنگل میں چھوڑ دیں جہاں ان کی نسل خوب پھلی پھولی۔ پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ صرف مصیصہ میں آٹھ ہزار بھینسیں شمار کی گئیں۔ ۱۰۶ھ / ۷۲۴ء میں سندھ میں شدید قحط رُونما ہوا تو ہزاروں کی تعداد میں جاٹ اپنے اہل و عیال اور مال مویشی کے ساتھ بلادِ فارس اور عرب ملکوں کی طرف نکل گئے۔ ان کے ساتھ جو بھینسیں گئی تھیں ان کی نسل بھی خوب چلی[۱۸]

عربوں اور سندھیوں کے اختلاط سے ایک نئی نسل وجود میں آئی جو "بیاسرہ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ سندھی باورچیوں کی عرب ملکوں میں بڑی مانگ تھی۔ وہ سندھی غلام جو کھانا پکانے کے ماہر تھے، عرب ملکوں میں بڑی قیمت پاتے تھے۔ اسی طرح سندھی کنیزوں کی عرب ملکوں میں بڑی مانگ تھی۔ ان کی تعریف میں جو اشعار کہے گئے ہیں وہ عربی شاعری کا شاہکار ہیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری کتاب المعلق اور کتاب المعارف کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ کی ایک اُم ولد سلافہ یا غزالہ کا تعلق سندھ سے تھا[۱۹] اسی طرح امام زین العابدینؒ علی بن حسینؓ کی ایک اُمِ ولد کا نام حیدران تھا اور اس کا تعلق بھی بلادِ سندھ سے تھا[۲۰] مروان بن محمد کے زمانے میں یزید بن عمر بن ہبیرہ پانچ سال تک عراق میں گورنر کی حیثیت سے مقیم رہے۔ ان کی والدہ بھی سندھی کنیز تھیں اور تو اور اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک (م ۷۴۳ء) کے حرم میں بھی ایک سندھی کنیز موجود تھی جس کے بطن سے سعید بن ہشام پیدا ہوا تھا[۲۱]

مسلم فاتحین کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بحیرۂ عرب اور خاص طور پر گجرات اور سندھ کے ساحلی علاقوں کو بحری قزاقوں سے پاک کر کے عرب اور سندھ و ہند کے درمیان تجارت کو فروغ دیا ۔ سندان کے حکمران محمد بن فضل نے ستّر جہازوں کا بیڑا تیار کرایا اور گجرات و سندھ کے ساحل پر قزاقوں کے تمام ٹھکانے ختم کر دیئے[۲۲] اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ عدن ، حبشہ ، سراندیپ ، سیراف ، بصرہ اور چین تک سے بحری جہاز تجارتی سامان لے کر بِلاخوف و خطر سندان آنے لگے ۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے معاشرہ بہت سی برائیوں سے پاک ہو گیا ۔ مؤرخِ شہیر مقدسی اس پر گواہ ہے کہ ملتان کے بازاروں میں عورتیں دیکھنے میں نہیں آتیں ۔ وہاں زِنا اور شراب کا نام لوگوں کی زبانوں پر نہیں آتا ، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے قتل کر دیتے ہیں ۔ ملتان کے تاجر خرید و فروخت کرتے وقت جھوٹ نہیں بولتے ۔ اسی طرح نہ وہ کم ناپتے ہیں اور نہ ہی تول میں ہیرا پھیری کرتے ہیں ۔ وہ اجنبیوں سے بہت پیار کرتے ہیں ۔ ملتان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہت ہے[۲۳]

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے وسط میں مکران میں دولتِ معدانیہ کا قیام عمل میں آیا ۔ اس خاندان کا بانی عیسیٰ بن معدان مذہباً خارجی تھا ۔ مؤرخین نے اس خانوادے کے چار حکمرانوں کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا ہے ۔ اگرچہ چوتھے حکمران ابُوالعساکر حسین کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک اس کی اولاد برسرِ اقتدار رہی لیکن ان کا ذکر کتبِ تواریخ میں نہیں ملتا ۔ خوارج کے عقیدے کے مطابق گناہِ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اس لئے ان کی مملکت سے شراب نوشی ، زنا اور چوری جیسے قبیح جرائم مفقود ہو گئے تھے[۲۴]

مقدسی رقمطراز ہے کہ سندھ میں علم و ادب کا بڑا چرچا تھا اور وہاں کے باشندے زُہد و عبادت کے لئے مشہور تھے ۔ جب شیراز و اہواز میں اہلِ علم محفلیں جماتے تو وہ سندھ کے علماء اور زہاد کی مثالیں دیا کرتے تھے ۔

عباسی خلفاء کے دور میں ہندوؤں کے علوم عربوں میں متعارف ہوئے اور کئی نامور ہندو وَید سندھ اور ہند سے نقلِ مکان کر کے بغداد میں جا بسے ۔ ان وَیدوں میں

منکہ (منگا) سرفہرست تھا ۔ وہ ہارون الرشید (م ۸۰۹ء) کے عہد میں بغداد آیا اور اس کا ذاتی معالج مقرر ہوا[25] وہ برمکی ہسپتال میں مریضوں کا علاج کیا کرتا تھا ۔ " سسرت " کا شمار آیورویدک (ہندوؤں کا فنِ طب) کی بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے ۔ منکہ نے اس کا سنسکرت زبان سے عربی میں ترجمہ کیا اور برمکی ہسپتال کے ایک دوسرے ہندی وَید ابنِ دھن نے اس اہم کتاب کی شرح لکھی ۔ منکہ نے سمّیات (Poison) کے موضوع پر شاناق (چانک) کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا ہندی سے فارسی میں بھی ترجمہ کیا[26]

کنکہ (گنگا) ہندو فلاسفہ اور اطباء میں ایک ممتاز عالم تھا ۔ طب ، خواصِ ادویہ اور مزاجِ موجودات کے بارے میں اسے خاص بصیرت حاصل تھی ۔ اس کی سات کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا[27] ابنِ ابی اصیبعہ نے بھی اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے[28]

ان ہندی اور سندھی وَیدوں میں جو بغداد میں جا بسے تھے صنجھل کا بڑا اُونچا مقام تھا ۔ اس نے طب کے موضوع پر سنسکرت میں لکھی گئی متعدد کتابوں کو عربی کے قالب میں ڈھالا[29] جو در (جدھر) بھی اسی زمانے کا ایک نامور ہندو فلسفی ، ہیئت دان اور وَید تھا ۔ اس نے اپنی ایک سنسکرت میں لکھی ہوئی کتاب کا ۔ کتاب الموالید ۔ کے عنوان سے عربی میں ترجمہ کیا تھا[30] شاناق (چانک) ایک نامور وَید تھا ۔ اس نے سنسکرت زبان میں سمّیات کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا منکہ نے عربی میں ترجمہ کیا تھا ۔ شاناق نے بڑے معرکے کے علاج کئے تھے ، اس لئے ہندو وَیدوں میں اسے بڑا اُونچا مقام حاصل تھا ۔ وہ خود تو عراق نہیں گیا لیکن اس کی تصنیف نے مسلمانوں کے فنِ طب پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے ۔ صالح بن بہلہ بھی ایک معروف وَید تھا اور اس نے ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی[31] ابنِ دھن مشہور ہندوستانی وَید دھن ونتری کا پوتا تھا ۔ اس نے اپنی لیاقت سے بغداد میں اپنے لئے مقام پیدا کیا اور وہاں برمکی ہسپتال کا انچارج مقرر ہوا[32] ۔ مشہور طبیب ابنِ ابی اصیبعہ نے " طبقات الاطباء " میں ہندی اور سندھی وَیدوں پر ایک خاص باب باندھا ہے ۔

ہندوستان کے ایک قدیم ہندو حکمران راجہ دیواشرن (داشلیم) کے عہد میں ایک دانشمند برہمن وِدّیا پتی (بیدپا) نے اصلاحِ اخلاق اور تربیتِ نفس سے متعلق

سنسکرت زبان میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے رمزیہ کرداروں کے ذریعے ایسی باتیں بیان کیں جن سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے عقل بڑھتی ہے ۔ عبداللہ بن مقفّع نے اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ۔ اس سے قبل یہ کتاب فارسی زبان کے قالب میں ڈھالی جا چکی تھی ۔ عربی ترجمے کا نام " کلیلہ و دمنہ " رکھا گیا اور اس تصنیف نے عربی اور فارسی ادب پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے ۔

طبّی اور اخلاقی موضوعات کے علاوہ علم ہیئت پر سنسکرت میں لکھی ہوئی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا ۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (م ۷۷۵ء) علمِ ہیئت میں بڑی دلچسپی لیتا تھا ۔ اس کے عہد میں اس فن پر ہندوؤں کی لکھی ہوئی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا ۔

یوں عربوں کے دورِ حکومت میں سندھ اور عرب ممالک کے درمیان آزادانہ آمد و رفت سے دونوں قومیں ایک دوسرے کے علوم سے متعارف ہوئیں ۔

عربوں کے عہد میں علم و ادب

مسلمان جہاں کہیں بھی گئے انہوں نے علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں کوئی کسر باقی اٹھا نہ رکھی ۔ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقے میں جا بجا مساجد تعمیر کروائیں جہاں بہت جلد علومِ اسلامیہ کا درس شروع ہو گیا اور ان مساجد سے ایسے باکمال عالم فارغ التحصیل ہو کر نکلے جنہوں نے مکّہ مکرّمہ ، مدینہ منوّرہ ، کوفہ ، دمشق اور بغداد کے علماء سے اپنی علمیّت کا لوہا منوایا ۔

محمد بن قاسم کا جانشین یزید بن ابی کبشہؒ جبرئیل سکسکی بڑا علم دوست انسان اور بلند پایہ محدّث تھا ۔ اسے صحابہ کرامؓ کی صحبت میّسر آئی تھی اور اس نے حضرت ابُوالدرداؓ اور جلیلؓ بن یوُسف سے حدیثیں روایت کی ہیں ۔ خود اس کے تلامذہ میں ابُوبشر ، الحکیم بن عتبہ ، علی بن الاقمر ، معاویہ بن قرہ المزنی اور ابراہیم سکسکی جیسے نامور راوی شامل ہیں ۔ امام بخاریؒ نے الصحیح میں ، امام الشیبانیؒ نے کتاب الآثار میں اور امام حاکم نیشا پوریؒ نے المستدرک میں یزید بن ابی کبشہؒ کی روایتیں نقل کی ہیں [1] ہمارے خیال میں یہ اس کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے ۔

اسرائیل بن موسیٰ البصریؒ کا شمار بھی قدیم محدّثین میں ہوتا ہے ۔ موصوف کو تبع تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ اس بزرگ نے امام حسن بصریؒ ، ابی حازم الاشجی ، محمد بن سیرین اور وہب بن منبّہ بن سعید القطان سے حدیثیں روائت کی ہیں [2] وہ بڑے ثقہ محدّث تسلیم کئے جاتے ہیں ۔ امام بخاریؒ نے ان کی روایات کو اپنی " الصحیح " میں جگہ دی ہے [3]

عمرو بن مُسلم باہلی ، قتیبہ بن مُسلم باہلی فاتح ماوراء النہر کے بھائی تھے ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں سندھ کا گورنر مقرر کیا تھا ۔ عمرو نے اپنے دورِ امارت میں سندھ سے باہر نکل کر ہندوستان پر کئی کامیاب حملے کئے ۔ عمرو کی زندگی اگرچہ سپاہیانہ تھی مگر وہ ترویج و اشاعتِ علوم کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہے ۔ انہوں نے

یعلیٰ بن عبید سے حدیثیں روائت کی ہیں ۔ خود ان کے تلامذہ میں ابو الطاہر نے فنِ حدیث میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔[4]

موسیٰ بن یعقوب ثقفیؒ کا شمار سندھ کے ابتدائی دَور کے علماء میں ہوتا ہے ۔ موصوف محمد بن قاسم فاتح سندھ کے ہم قبیلہ تھے اور اسی کے ساتھ سندھ آئے تھے۔ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کے پایہ تخت الور کی فتح کے بعد انہیں وہاں کا خطیب مقرر کیا۔ یہ عہدہ ان کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا ۔ علی بن حامد کوفی ان کے احفاد سے ملا تھا اور انہیں سے اسے فتحنامہ سندھ کا مسودہ ، جو عربی زبان میں لکھا ہوا تھا، دستیاب ہوا تھا۔[5]

مفضّلؒ بن المہلب کو تابعی ہونے کی سعادت حاصل ہے اور سرزمینِ پاکستان کو ان کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ ان کے بھائی یزید بن المہلب نے یزید بن عبدالملک (م ۷۲۴ء) کے عہدِ خلافت میں سرکشی اختیار کی اور وہ سرکاری فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا ۔ اس کے رشتہ داروں نے ، جن میں مفضّل بھی شامل تھے ، قندابیل میں پناہ لی[6] اسی اثناء میں خلیفہ کا عامل ہلال بن احوز وہاں پہنچ گیا اور اس نے مقامی گورنر کی مدد سے ان کا مقابلہ کیا ۔ یزید بن المہلب کے بہت سے رشتے دار دادِ شجاعت دیتے ہوئے میدانِ کارزار میں کام آئے ۔ ان مقتولین میں مفضّل سرفہرست تھے۔[7] مفضّل نے مشہور صحابی نعمانؓ بن بشیرؓ سے حدیثیں روائت کی ہیں اور خود ان سے حدیث کی سماعت کرنے والوں میں ان کے فرزند حاجب بن مفضّل ، ثابت البنانی اور جریر بن حزم قابل ذکر ہیں ۔ محدّثین کرام نے مفضّل کو ثِقہ تسلیم کیا ہے[8] ۔ ان کی مرویات سُننِ ابی داوٗد اور سُننِ نسائی میں موجود ہیں۔[9]

عربوں کے ابتدائی ایامِ حکومت میں جو اہلِ علم و فضل عرب سے سندھ آکر آباد ہوئے ان میں جناب ابو حفص ربیع بن صبیح بصریؒ بھی تھے ۔ ان کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے ۔ موصوف امام حسن بصریؒ کے صحبت یافتہ تھے ۔ مؤرخین نے انہیں عابد ، صالح اور مجاہد لکھا ہے ۔ موصوف نے عباسی خلیفہ مہدی (م ۷۸۵ء) کے عہدِ خلافت میں عبدالملک بن شہاب مسمعی کی قیادت میں گجرات کے ساحلی مقام باربد (بھاڑ بھُوت) کی بحری مہم میں حصہ لیا اور واپسی پر سمندری سفر کے دوران فوت ہو گئے[10] ان

کا مزار "کچھ" سے قریب کسی جزیرے میں بتایا گیا ہے۔ ابُو حفص بڑے ثِقہ محدّث تھے[11] ان کے شاگردوں میں امام سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، ابُوالولید طیالسی، ابُوالحسن آدم بن عبدالرحمٰن خراسانی، ہشام بن عبدالملک باہلی، ابوالحسن عاصم بن علی واسطی، ابُو سلیمان داؤد اور امام شافعی کے اُستاد ابُو سفیان وکیع بن الجراح کوفی جیسے اساطینِ علم و فضل شامل ہیں[12]۔ ابُو حفص ربیع نے سندھ میں احادیثِ نبوی کا درس شروع کیا اور انہوں نے علم کی جو شمع روشن کی اس کی ضَو سے پُورا سندھ منوّر ہو گیا۔

عربوں کے دورِ حکومت میں سندھ کی خاکِ پاک سے جو اہلِ علم پیدا ہوئے ان میں ابُو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی کا نام سرِفہرست ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کے والدین سندھی تھے لیکن وہ خود یمن میں پیدا ہوئے۔ موصوف حافظ الحدیث ہونے کے علاوہ سیر و مغازی کے زبردست عالم تھے۔ ان کیؒ کتاب مغازیؒ بڑی مستند سمجھی جاتی ہے۔ ابُو معشر تابعی تھے اور انہیں حضرت ابوامامہ سہیلؒ بن حنیف جیسے بزرگ صحابی کی زیارت کا شرف حاصل تھا[13] ان کے اساتذہ میں ہشام بن عُروہ بن زبیرؒ، محمد بن کعب قرظی، موسیٰ بن بشار، نافع مولیٰ ابن عمر، محمد بن منکدر اور محمد بن قیس جیسے اساطینِ علم شامل تھے۔ ابُو معشر نے مدینہ منوّرہ اور بغداد میں درسِ حدیث دیا اور عرب و عجم کے نامور علماء نے ان سے حدیث کی سَند لی۔ عباسی خلیفہ کے دربار میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور جب ان کا انتقال ہوا تو خلیفہ نے خود اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی[14]

اس زمانے کے سندھی علماء میں الحافظ الامام ابُو بکر محمد بن رجاء کا بڑا اُونچا مقام تھا۔ موصوف نے اسحٰق بن راہویہ، احمد بن حنبلؒ، علی ابن المدائنی، ابنِ نمیر اور امام بخاریؒ کے اُستاد ابُو بکر ابن ابی شیبہؒ سے حدیثیں روائت کی ہیں۔ خود ان کے تلامذہ میں ابُو عوانہ، ابن الاخرم، ابُوالنصر محمد بن محمد، محمد بن صالح ہانی اور ابُو حامد بن الشرقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے "مستخرج علیٰ صحیح مُسلم" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے[15]۔ ان کا انتقال ۲۸۶ھ / ۸۹۹ء میں ہوا[16]

الحافظ خلف بن سالم السندیؒ آلِ مہلب کے آزاد کردہ غلام اور اپنے عہد کے ایک نامور محدّث تھے۔ انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ان کا

شمار ثقہ راویوں میں ہوتا تھا۔ ابو بکر عیاش، یعقوب بن شعبہ اور یحییٰ بن معین جیسے عالموں نے ان کی علمیت کا لوہا مانا ہے۔ ان سے بہت سے لوگوں نے حدیث کی سماعت کی ہے۔ ان کا انتقال ۲۳۲ھ / ۸۴۶ء میں ہوا[17]

اسی طرح سندھ میں ابو عطاء افلح بن یسار (م ۱۶۸ھ / ۷۸۴ء) جیسا قادر الکلام شاعر پیدا ہوا۔ اس کے قصیدے نے عربی ادب کی مشہور کتاب الحماسۃ میں عرب شعراء کے قصائد کے ساتھ جگہ پائی[18]

سندھ میں عربوں کے دور حکومت میں ابو علی سندھی نام کے ایک بلند پایہ صوفی ہوئے ہیں جن سے مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ (م ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء) نے تصوّف کی تعلیم پائی تھی۔ ابو علی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عربی نہیں جانتے تھے[19] حضرت بایزید بسطامیؒ کے سوانح نگاروں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

انا تعلمتُ مِن ابی علی علم الفناء و التوحید و ھو تعلم مِنی الحمد و قل ھو اللہ احد[20]

(ترجمہ) میں نے ابو علی سے علم فنا اور توحید (وحدت الوجود) کی تعلیم حاصل کی اور انہوں نے مجھ سے الحمد اور قل ھو اللہ سیکھی۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی مشہور تصنیف "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" میں چونتیس ایسے عالموں، زاہدوں اور محدِّثوں کے نام گنوائے ہیں جو "سندھی" نسبت سے مشہور تھے۔ یہاں ان کا ذکر کرنا طوالت سے خالی نہ ہو گا۔

دیبل:

عربوں کے عہد حکومت میں دیبل کا شمار عالمِ اسلام کے عظیم علمی مراکز میں ہونے لگا تھا۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت الحموی (م ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء) نے "قد نسب الیھا قوم من الرواۃ (اس کی طرف راویوں کی ایک جماعت منسوب ہے) لکھ کر اپنی دانست میں اپنا فرض ادا کر دیا[21] طبقات قسم کی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دیبل میں بڑے نامی گرامی فقہاء علماء، صلحاء، قراءٔ محدِّثین اور مفسّرین مقیم تھے اور ایک عالم ان کے فیضانِ علم سے سیراب ہو رہا تھا۔

ایسے ہی علماء میں ہمیں احمد بن محمد بن ہارون المقری دیبلیؒ کا نام ملتا ہے جو اپنے عہد کے نامور محدّث اور قاری تھے۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انہوں نے علومِ مروّجہ کی تعلیم جعفر بن محمد الفریابی اور ابراہیم بن شریک الکوفیؒ سے پائی اور فنِ قرأت حسنون بن الہثیم سے بروایتِ حفص سیکھا۔ ان سے چند حدیثیں بھی مروی ہیں لیکن ان میں سب سے اہم وہ حدیثیں ہیں جن کی روائت انہوں نے چند واسطوں سے حضرت ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کی ہے۔ ان کا انتقال رجب ۳۷۰ھ / جنوری ۹۸۱ء میں ہوا۔[۲۲]

علی بن موسیٰ دیبلیؒ کا شمار چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نامور محدّثین کرام میں ہوتا ہے۔ یہ بزرگ دیبل میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد موصوف بغداد تشریف لے گئے، جہاں علماء کی ایک جماعت نے ان سے حدیث کی سماعت کی۔[۲۳]

خلفؒ بن محمد الموازینی کا شمار بھی دیبل کے اکابر علماء میں ہوتا ہے۔ یہ بزرگ علی بن موسیٰ دیبلیؒ کے شاگرد رشید تھے لیکن انہوں نے دیبل کی سکونت ترک کر کے بغداد کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ان کے تلامذہ میں سے ابوالحسن نے بڑا نام پایا ہے۔[۲۴]

ابوعبد اللہ محمد بن عبداللہؒ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے ایک صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے اور فنِ قرأت کے آئمہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں جعفر بن محمد سقیط، عبدالرزاق بن حسن اور سکن بن بکرویہ جیسے قاریوں کے نام گنوائے جاتے ہیں۔[۲۵] ابو عبداللہ نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ عربوں کو قرأت و تجوید کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

قاضی ابوالعباس احمد بن نصر دیبلیؒ کا شمار دیبل کے نامور زہاد اور اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ انہیں فقہ شافعی پر کامل دسترس تھی۔ ابوالعباس دیبل کی سکونت ترک کر کے بغداد میں جا بسے تھے جہاں قاضی القضاۃ ابوالفضائل القاسم بن یحییٰ نے انہیں قاضی کے عہدے پر فائز کیا۔[۲۶] ابوالعباس بڑے نیک اور متقی انسان تھے اور دین کے معاملات میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یاقوت الحموی (م ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء) نے ان کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں

ان کے لئے بڑا احترام تھا[۲۷]۔ ابُوالعباسؒ آخری عمر میں بغداد سے موصل منتقل ہو گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

ابُوالقاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلیؒ برعظیم پاک وہند کے ایک نامور محدّث تھے۔ ان کے سوانح حیات کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گذرے۔ ان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ دیبل سے ترکِ سکونت کرکے مصر چلے گئے تھے جہاں وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق کی تحقیق کے مطابق مشہور محدّث ابُوسعید بن یونسؒ ان کے تلمیذِ رشید تھے[۲۸]

علی بن احمد بن محمود دیبلیؒ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے ایک نامور فقیہ اور محدّث تھے۔ موصوف امام شافعیؒ کے مقلّد تھے اور انہوں نے فنِ قضاءُ پر "ادب القضا" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی تھی جس میں قضاء کے اہم مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہوں نے ابُوالعباس الاصم اور عبد اللہ بن احمد بن موسیٰ دیبلیؒ جیسے یگانہ روز گار محدّثین کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا تھا۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی تحقیق کے مطابق وہ مقریٔ شام ابُوعبداللہ محمد بن عبد اللہ دیبلیؒ کے نواسے تھے[۲۹]

ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلیؒ اپنے زمانے میں حدیث کے زبردست عالم مانے جاتے تھے۔ انہوں نے ابُو عبداللہ بن عبدالرحمن المخزومی، ابن المبارک اور ابی عبداللہ الحسین بن الحسن المروزی سے حدیثیں روائت کی ہیں۔ ابُو جعفر دیبل سے نقل مکان کرکے مکّہ مکرّمہ میں جا بسے تھے جہاں وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے[۳۰]۔ ان کے فرزندِ رشید ابراہیم نے بھی علمِ حدیث میں بڑا نام پیدا کیا۔ موصوف نے بھی اپنے والد کے ساتھ مکّہ مکرّمہ میں سکونت اختیار کرلی تھی[۳۱]

ابُوالعباس محمد بن محمد بن عبداللہ الوراقؒ دیبل کے باشندے تھے اور ان کا شمار وہاں کے زہاد و عباد میں ہوتا تھا۔ موصوف نے حدیث کی سماعت جعفر بن محمد بن الحسن، عبدان بن موسیٰ عسکری اور محمد بن عثمان بن ابی سوید بصری سے کی۔ علمِ حدیث میں ان کی عظمت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف امام حاکم نیشاپوری صاحبِ المستدرک کے استاد تھے[۳۲]

ابُو محمد دیبلیؒ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے ایک مشہور صُوفی اور سیّد الطائفہ جنید بغدادیؒ کے حاضر باش ساتھی تھے ۔ ابُو محمد دیبل سے ترک سکونت کر کے بغداد چلے گئے تھے ۔ حضرت جنیدؒ ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے [33]

ابُوالعباس احمد بن عبد اللہ بن سعید دیبلیؒ کا شمار چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نامور زاہدوں اور محدّثوں میں ہوتا ہے ۔ انہوں نے حصولِ علم کی خاطر بڑا طویل سفر کیا ۔ انہوں نے بصرہ میں ابا خلیفہ قاضی اور معداد جعفر بن محمد الفرمانی سے ، مکّہ مکرّمہ میں الفضل بن محمد جنیدی اور محمد بن ابراہیم دیبلی سے ، مصر میں علی بن عبدالرحمٰن اور محمد بن زیان سے ، دمشق میں ابا الحسن احمد بن عمیر سے ، بیروت میں ابا عبدالرحمٰن سے ، حرّان میں اباعروبہ الحسین بن ابی معشر سے اور تستر میں احمد بن زہیر سے حدیث کی سماعت کی ۔ ان کی عظمت اور شان کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ صاحبِ المستدرک امام حاکم نیشاپوری نے ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا تھا ۔

آخری عمر میں ابُوالعباس نے نیشاپور میں الحسن بن یعقوب الحدادی کی خانقاہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ موصوف ہمیشہ صوفیوں جیسا لباس زیب تن کرتے اور نماز کے لئے مسجد میں جانے کے علاوہ خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے تھے ۔ سمعانی سے روایت ہے کہ انہوں نے جمادی الثّانی ۳۴۳ ھ / اکتوبر ۹۵۴ء میں نیشاپور میں وفات پائی [34]

ابُوالقاسم الحسین بن محمد بن اسدؒ بھی دیبل کے ایک یگانہ محدِّث تھے ۔ ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ۳۴۰ ھ / ۹۵۱ء کے لگ بھگ دمشق میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے [35]

ابُوبکر محمد بن حسین بن محمد دیبلی چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے ایک بلند پایہ قاری اور مجوّد (ماہرِ تجوید) تھے ۔ انہوں نے قرأت کا فن امامِ قرائت ہارون اخفش کے دو نامور شاگردوں ابن ابی حمزہ اور ابن ابی داؤد سے سیکھا تھا ۔ ان کے تلامذہ میں امام حافظ ابُوالحسن علی بن عمرو دارقطنی اور عبدالباقی ابن حسن جیسے بزرگوں کے نام آتے ہیں ۔ انہوں نے بھی شام میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی [36]

ابُو موسیٰ دیبلیؒ کا شمار تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اکابر

صوفیاء میں ہوتا ہے ۔ یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامیؒ کے بھانجے تھے اور اپنے ماموں سے فیض یاب ہوئے تھے ۔ ابو موسیٰ سے بایزید بسطامیؒ کے متعدد اقوال منقول ہیں[۲۷]

ابو محمد حسن بن حامد دیبلیؒ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے ایک بلند پایہ ادیب، شاعر اور محدّث تھے اور ان کا شمار بغداد کے مالدار تاجروں میں ہوتا تھا ۔ انہوں نے بغداد میں ایک سرائے بنوائی تھی جو ان کے نام کی مناسبت سے " سرائے خان ابنِ حامد " کہلاتی تھی ۔ ابو محمد نے حدیث کی سماعت علی بن محمد بن سعید موصلی سے کی تھی ۔ خود ان کے شاگردوں میں محمد بن علی صوری نے علمِ حدیث میں بڑا نام پیدا کیا ۔ عربی شاعری میں بھی ابو محمد کا بڑا اونچا مقام تھا اور مشہور شاعر المتنبیؒ کے ان کے ساتھ بڑے دوستانہ مراسم تھے اور وہ بغداد میں قیام کے دوران میں انہی کے ہاں مہمان ہوا کرتا تھا ۔ المتنبیؒ کہا کرتا تھا کہ اگر وہ کسی تاجر کی تعریف کرتا تو ابو محمد کا ذکر اپنے اشعار میں ضرور کرتا ۔ ابو محمد نے کچھ عرصہ مصر میں بھی حدیث کا درس دیا اور وہیں ۴۵۳ ھ / ۱۰۶۱ء میں انہوں نے وفات پائی[۲۸]

دیبل کی یہ علمی بساط زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی ۔ اغلباً دریائے سندھ کے رُخ بدلنے سے یہ شہر اپنی تجارتی اہمیّت کھو بیٹھا اور یہاں کے متموّل اور تاجر پیشہ لوگ دوسرے تجارتی مراکز میں جا بسے اور اس کا اثر یہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر بھی مرتب ہوا ۔ بزمی انصاری نے اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ میں ۲۸۰ ھ / ۸۹۳ء میں آنے والے زلزلے کو دیبل کی تباہی کا سبب بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے[۲۹] یاقوت الحموی نے دیبل میں زلزلہ آنے کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ طبری اور ابنِ اثیر لکھتے ہیں کہ ۲۸۰ ھ / ۸۹۳ء میں آرمینیہ کے مشہور شہر دبیل میں بڑا زبردست زلزلہ آیا جس کے نتیجے میں ڈیڑھ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے[۳۰] بعد میں آنے والے مؤرخین نے دبیل کو دیبل سمجھ لیا ۔

منصورہ:

دیبل کے بعد سندھ میں علم و ادب اور صنعت و تجارت کا دوسرا بڑا مرکز منصورہ تھا ۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت الحموی (م ۶۲۶ ھ / ۱۲۲۹ء) نے منصورہ کا تعارف " مدینۃ کبیرۃ کثیر الخیرات ذات جامع کبیرہ " (یہ بڑا شہر ہے ۔ وہاں نیکی بہت ہے اور وہاں

ایک بڑی جامع مسجد ہے) کے الفاظ میں کرایا ہے[41] مؤرخِ شہیر مقدسی نے اس " جامع کبیرۃ " کا محل وقوع " وسط الاسواق " (بازاروں کے درمیان) بتایا ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مسجد عمان کی مسجد سے مشابہ تھی ۔ اس نے یہاں کے باشندوں کو اصحاب علم و مروت بتاتے ہوئے ان کی ذکاوت اور اسلام دوستی کی بڑی تعریف کی ہے ۔ منصورہ میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو تمسک بالحدیث کرتے تھے ۔ مقدسی کے زمانے میں منصورہ کپڑے اور چمڑے کی صنعت کا بڑا اہم مرکز تھا اور یہاں کے تیار کردہ کپڑے اور جوتے دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے[42] ابن حوقل لکھتا ہے کہ منصورہ میں شہد اور گنے کی بہتات ہے[43] اصطخری نے بھی منصورہ اور اس کے نواح میں آم اور لیموں کی افراط بتائی ہے[44] ابن الفقیہ الھمذانی نے بھی سندھ میں " عجائب کثیرہ " کی موجودگی کا ذکر کیا ہے[45] وہاں عربی اور سندھی زبانوں کا چلن تھا ۔ شہر کو دریا گھیرے ہوئے تھا ۔ شہر کے چار دروازے تھے جو باب سندان ، باب طوران ، باب ملتان اور باب البحر کے ناموں سے موسم تھے ۔

دیبل کی طرح منصورہ میں بھی اہل علم و فضل کی ایک جماعت موجود تھی ۔ منصورہ میں ابو جعفر عبداللہ بن اسمٰعیل بن ابراہیم المعروف بہ ابن بویہ (Ibn Buwayh) بڑے بلند پایہ عالم تھے ۔ سمعانی نے انہیں ثقہ محدث بتایا ہے ۔ ان سے محدّثین کی ایک بڑی جماعت نے حدیث کی سماعت کی ہے ۔ انہوں نے ۳۴۹ھ / ۹۶۰ء میں وفات پائی[46]

ابوُ محمد عبداللہ بن جعفر بن حرہؒ بھی منصورہ کے ایک نامور محدِّث اور قرآن مجید کے مستند قاری تھے ۔ انہوں نے سماعتِ حدیث حسن بن مکرم اور ان کے ساتھیوں سے کی تھی ۔ ان کی علمی شان کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ مشہور محدِّث امام حاکم نیشاپوری ان کے تلامذہ میں شامل تھے[47]

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں امام داوٗد ظاہری (م ۲۷۰ھ / ۸۸۴ء) کے پیروٗ بڑی تعداد میں منصورہ میں آلبسے ۔ ان میں ایک فاضل ابوُالعباس احمد بن محمد بن صالح تمیمی بھی تھے جو منصورہ میں منصبِ قضاء پر فائز تھے ۔ انہوں نے اپنے مذہب کی تائید میں کئی بلند پایہ کتابیں لکھیں جن میں سے کتاب المصباح کبیر، کتاب الہادی اور کتاب النیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں[48] سمعانی سے

روائت ہے کہ یہ بزرگ آخری عمر میں منصورہ سے عراق چلے گئے۔ انہیں بھی امام حاکم نیشاپوری کا استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔[49]

قاضی ابو محمد داؤدی کا شمار بھی منصورہ کے فضلاء میں ہوتا ہے۔ موصوف ظاہری مذہب کے امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ مشہور جغرافیہ دان اور سیّاح مقدسی نے ان سے منصورہ میں ملاقات کی تھی اور ان کی تصانیف دیکھی تھیں جو اس کی رائے میں بڑی بلند پایہ تھیں۔[50]

ابُوبکر احمد بن محمد منصوری بکر آبادی بھی منصورہ کے ایک بلند پایہ فقیہ اور محدّث تھے۔ انہوں نے حدیث کی سماعت امام ابی بکر اسمٰعیلی اور حافظ ابنِ عدی سے کی تھی۔ موصوف منصورہ کی سکونت ترک کرکے جرجان کے ایک نواحی قصبے بکر آباد میں جا بسے تھے۔[51] ان کا انتقال ۲۹ جمادی الاول ۴۲۲ھ / ۲۳ جون ۱۰۳۱ء کو بکر آباد میں ہوا۔[52]

بُوقان:

دیبل اور منصورہ کے بعد تیسرا بڑا علمی مرکز بُوقان تھا۔ اس کا صحیح محلِ وقوع تاحال معلوم نہیں ہو سکا۔ یاقوت الحموی (م ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء) نے اسے وھو بارض السند لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔[53] میرے خیال میں بُوقان سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر سندھ کی حدود میں آباد تھا۔

بُوقان کے علماء میں ابُوسعید بن اسعد بن محمد بُوقانی بڑے اونچے پایہ کے عالم تھے اور ان کا شمار چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے مشاہیر شافعی علماء میں ہوتا تھا۔ ان کے فخر و مباہات کے لئے کیا یہ کم ہے کہ وہ امام محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کے شاگردِ رشید تھے۔ ابُوسعید ذی قعدہ ۵۵۶ھ / اکتوبر ۱۱۶۱ء میں غزوں کے حملے میں شہید ہوئے۔[54]

محمد بن احمد بن منصور بُوقانی چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے ایک نامور محدّث تھے۔ انہوں نے حدیث کی سماعت مشہور محدّث امام ابُو حاتم بن محمد بن حبان بستی (م ۳۵۵ھ / ۹۶۵ء) سے کی تھی۔[55] اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم


افغانستان
پنجاب
ملتان
ہندوستان
منصورہ
کیکان
قصدار
راجستھان
بلوچستان
بوقان
برہمناباد
محفوظہ
سندھ
دیبل
بیلمان
گجرات

نہ ہو سکے۔

ابُوالمکارم فضل اللہ بن محمد بُوقانی کا شمار پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے نامور محدّثین میں ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ موصوف امام بغویؒ صاحبِ "المصابیح" کے آخری شاگرد تھے [۵۶]

محمد بن احمد بن محمد بن خلیل بن احمد بُوقانیؒ (۴۶۷ھ / ۱۰۷۴ء) میں بُوقان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حدیث کی سماعت امام ابوبکر بن خلف شیرازی سے کی۔ ان کے شاگردوں میں عبدالرحیم بن سمعانی نے علمِ حدیث میں بڑا نام پیدا کیا۔ موصوف محرّم ۵۴۸ھ / اپریل ۱۱۵۳ء میں بُوقان میں فوت ہوئے۔ [۵۷]

قصدار:

سندھ کے دوسرے شہروں کی طرح قصدار بھی علم و ادب کا ایک بڑا مرکز تھا اور اس شہر کی خاکِ پاک سے کئی نامور علماء اٹھے جو دنیائے علم و ادب میں مہر و ماہ بن کر چمکے۔ آج کل قصدار بلوچستان کے قلات ڈویژن کا مرکزی مقام ہے لیکن عربوں کے دورِ حکومت میں یہ سندھ سے متعلق تھا۔ اسے قزدار اور خضدار بھی لکھا جاتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے عربوں نے اس شہر کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا تھا۔

اِصطخری کے زمانے میں وہاں مغیرہ بن احمد نامی ایک شخص حکمران تھا جو عباسی خلیفہ کی اطاعت کا دم بھرتا تھا۔ اس کی مملکت میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا [۵۸]۔ قصدار کے علماء میں محمد جعفر بن الخطابؒ بڑے بلند پایہ محدّث اور فقیہ تھے اور وہ اپنے عصروں میں زہد و ورع کے لئے ضرب المثل تھے۔ انہوں نے حدیث کی سماعت ابُوالفضل عبدالصمد بن محمد بن نصیر العاصمی سے کی اور خود ان کے تلامذہ میں ابُوالفتوح عبدالغافر بن الحسین بن علی الکاشغری نے علمی اور دینی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ محمد جعفر آخری عمر میں قصدار کی سکونت ترک کر کے بلخ میں جا بسے تھے [۵۹]

ابُوداوٗد سیبویہ بن اسمٰعیل کا شمار پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل کے مشاہیر محدّثین میں ہوتا ہے۔ یہ بزرگ قصدار کی سکونت ترک کر کے مکّہ مکرّمہ میں جا بسے تھے جہاں وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے

اساتذہ میں ابُوالقاسم علی بن محمد بن عبداللہ بن مکیئ ، طاہر حسینی ، ابُوالفتح رجاء بن عبدالواحد اصبہانی اور حافظ ابوالحسین مکیئ بن ابی الحسن رواسی جیسے اساطینِ علم کے نام گنوائے جا سکتے ہیں ۔ ابُوداوُد سیبویہ نے ۴۶۱ ھ / ۱۰۶۸ء کے لگ بھگ مکّہ مکرّمہ میں انتقال کیا۔[۶۰]

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل میں رابعہ بنت کعب قزداری نام کی ایک خاتون نے ، جو زین العرب کے لقب سے مشہور تھی ، قزدار کا نام روشن کیا ۔ وہ اپنے حسن و جمال اور فضل و کمال میں اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئی تھی[۶۱] وہ عربی اور فارسی کی بلند شاعرہ تھی ۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں اس کا ذکر نیک بخت عارفہ بیبیوں کے عنوان کے تحت کیا ہے ۔ عوفی نے لباب اللباب میں اس کے اشعار نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ وہ مردوں پر سبقت لے گئی تھی[۶۲]

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے وسط میں قصدار ، کیز ، مکران اور کرمان پر خوارج کا تسلّط ہو گیا اور انہوں نے یہاں آزاد و خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی ۔ لیکن ان کے چوتھے حکمران ابُوالعساکر حسین کو مجبوراً سلطان مسعود غزنوی کی بالا دستی تسلیم کرنا پڑی ۔ قصدار اور اس کے گرد و نواح میں خوراج کا تسلّط قائم ہو جانے کے بعد سُنّی علماء وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قصداری نسبت رکھنے والے بزرگوں کو بلخ اور مکّہ مکرّمہ میں زندگی گزارتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔

الور:

راجہ داہر کا پایہ تخت الور سندھ کے دوسرے شہروں کی طرح کبھی بھی علمی مرکز نہ بن سکا ۔ تاہم وہاں ایک علمی خاندان محمد بن قاسم کے زمانے سے آباد چلا آتا تھا جس نے مسلمانوں کی علمی روایات کو صدیوں تک برقرار رکھا ۔ علی بن حامد کوفی کی ملاقات الور میں اسمٰعیل بن علی بن محمد بن موسیٰ بن طائی بن یعقوب ثقفی سے ہوئی تھی جو اپنے زمانے کے ایک نامور فقیہ اور الور کے قاضی اور خطیب تھے[۶۳] موصوف کو یہ دونوں مناصب ورثہ میں ملے تھے ۔ فتحنامہ سندھ کے ایک اندراج سے یہ ثابت ہوتا ہے

کہ موصوف کے مورثِ اعلیٰ کو فاتح سندھ محمد بن قاسم نے دارالحکومت الور کا قاضی اور خطیب مقرر کیا تھا۔ علی بن حامد کوفی کو فتحنامہ سندھ کے عربی اوراق قاضی اسمٰعیل سے ہی ملے تھے جس کا ترجمہ اس نے فارسی میں چچ نامہ کے عنوان سے کیا۔[۶۴]

ترجمۂ قرآن:

اسی دور میں سندھ کے ایک ہندو راجہ کی فرمائش پر سندھ کے ایک عالم نے قرآنِ حکیم کا سندھی زبان میں پہلی بار ترجمہ کیا۔ اغلباً یہ قرآن حکیم کا کسی دوسری زبان میں پہلا ترجمہ تھا۔

ملتان:

ملتان کا شمار بھی اس زمانے میں سندھ کے شہروں میں ہوتا تھا۔ جب مشہور سیّاح ابنِ حوقل ملتان آیا تو اس نے ملتانیوں میں قرآن اور علومِ قرآن کی طرف رغبت پائی۔ اس زمانے میں ملتان میں سبعہ کے قاری موجود تھے۔ ابنِ حوقل نے وہاں ایسے حضرات سے ملاقات کی جو فقہ اور ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس نے ملتان میں علماء کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کے نام نہیں گنوائے۔[۶۵] مقدسی کے زمانے میں وہاں شیعہ موجود تھے اور وہ اذان میں حی علیٰ خیر العمل کہا کرتے تھے۔ ملتان کے نواحی دیہات میں احناف کی اکثریت تھی اور وہاں حنابلہ، مالکیہ اور معتزلہ کا وجود نہ تھا۔ زکریا قزوینی لکھتا ہے کہ ملتان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہت ہے۔

میلسی —— وہاڑی روڈ پر میلسی سے چھ میل کے فاصلے پر اڈہ ہری چند سے قریب موضع دھلو میں حضرت ابو بکر ورّاقؒ کا مزار ہے جہاں ماہ چیت میں عرس کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ ان کے مستند سوانح حیات کہیں سے نہیں ملتے۔ اس نام کے ایک بزرگ کا ذکر حضرت سیّد علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں کیا ہے جو صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔[۶۶] ابنِ بطوطہ اپنے سفر کے دوران موضع دھلو سے گزرا تھا۔ اس زمانے میں اسے ابی بکھر کہتے تھے۔ یہ بزرگ یقیناً عربوں کے دورِ حکومت میں یہاں آبسے تھے۔ حضرت سیّد علی ہجویریؒ نے جس ابو بکر ورّاقؒ کا ذکر کیا ہے، وہ ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء میں فوت ہوئے تھے۔ ان کا تعلق بلخ سے بتایا جاتا ہے۔

محمد بن قاسم رن کچھ سے آگے بڑھ کر کیرج فتح کر چکا تھا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں کے باشندوں نے اس کا مجسمہ تیار کیا تھا۔ کیرج کے گرد و نواح میں ہندوؤں کی عملداری تھی لیکن ان کے حکمرانوں کا مسلمانوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک تھا۔ بھیلمان گجرات کے گوجر راجگان کا پایۂ تخت تھا۔ وہاں بھی چند نامور عالم گذرے ہیں جن کا ذکر تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ ان علماء میں عبدالرحمن بن ابو زید بیلمانی، محمد بن عبدالرحمن بیلمانی، محمد بن حارث بیلمانی اور محمد بن ابراہیم بیلمانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو کی ابتداء:

بابائے اُردو مولوی عبدالحق (م ۱۹۶۱ء) لکھتے ہیں کہ اُردو کی ابتداء اسی روز ہو گئی تھی جس رُوز محمد بن قاسمؒ نے سندھ میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اس نے ایک رُوز اپنے ساتھیوں سے " انگول " کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ اگر کوئی شخص اپنے بدن پر پانی بہالے اور سر نہ دھوئے تو اس عمل کو " انگول " کہتے ہیں۔ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے آبائی وطن ہاپوڑ میں بڑی بُوڑھیاں آج تک یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کرتی ہیں۔

محمد بن قاسمؒ نے راجہ داہر کے وزیر سیاکر کو اپنا وزیر بنایا اور حکومت کے مختلف محکموں میں برہمنوں کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال رکھا۔ ان کے ساتھ بات چیت کے لئے اسے لازماً مقامی زبان کے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہو گا۔ یُوں فتح سندھ کے ساتھ ہی اُردو کی نشو و نما شروع ہو گئی۔

حواشی

محمد بن قاسمؒ اور اس کے جانشین

۱ - ابوالجلال ندوی ، ماہنامہ ماہ نو کراچی ، بابت ماہ اگست ۱۹۵۶ء ، ص ۲۳ -
۲ - ابوالجلال ندوی ، مصدر سابق ، بابت نومبر ۱۹۵۶ء ، ص ۲۷ -
۳ - سید سلیمان ندوی ، عربوں کی جہاز رانی ، بمبئی : ۱۹۵۸ء ، ص ۳ -
۴ - قاضی اطہر مبارکپوری ، خلافت امویہ اور ہندوستان ، دہلی : ۱۹۷۵ء ، ص ۲۸۶ -
۵ - سعید احمد اکبر آبادی ، صدیق اکبرؓ ، دہلی : ۱۹۷۶ء ، ص ۲۲۵ -
۶ - سید سلیمان ندوی ، عرب و ہند کے تعلقات ، الہ آباد : ۱۹۳۰ء ، ص ۹ -
۷ - ایضاً ، ص ۶۳ تا ۷۰ -
۸ - ایضاً ، ص ۷۲ -
۹ - قرآن مجید ، سورۃ الکہف : ۳۱ ، سورۃ الدخان : ۵۳ ، سورۃ الدھر : ۲۱ -
۱۰ - قاضی اطہر مبارکپوری ، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ، دہلی : ۱۹۶۹ء ، ص ۳۹ -
۱۱ - بلاذری ، فتوح البلدان ، بیروت : ۱۹۵۷ء ، ص ۶۰۷ -
۱۲ - اطہر مبارکپوری ، خلافت راشدہ اور ہندوستان ، دہلی : ۱۹۷۲ء ، ص ۱۰۳ -
۱۳ - بھڑوچ اس زمانے میں گجرات کا مرکزی شہر تھا -
۱۴ - بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۰۷ -
۱۵ - خورشید احمد فارق ، حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط ، دہلی : ۱۹۷۶ء ، ص ۲۳۹ -
۱۶ - ابن اثیر ، الکامل فی التاریخ ، بیروت : ۱۹۶۵ء ، ج ۳ ، ص ۱۶ -
۱۷ - ایضاً -
۱۸ - علی بن حامد کوفی ، فتحنامہ سندھ ، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ، اسلام آباد : ۱۹۸۳ء ، ص ۵۴ -
۱۹ - ایضاً -
۲۰ - ایضاً ، ص ۵۵ -
۲۱ - ایضاً -
۲۲ - ایضاً ، ص ۵۶ -
۲۳ - ایضاً ، ص ۵۷
۲۴ - ایضاً ، ص ۵۸ -
۲۵ - ایضاً ، ص ۵۶ -
۲۶ - ایضاً ، ص ۵۹ -
۲۷ - ایضاً ، ص ۶۰ -

۲۸ ۔اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الھند ، قاہرہ : ۱۳۹۸ھ ، ص ۵۳۳ ۔

۲۹ ۔ الم تران الازد لیلۃ بیتوا بہنۃ کانوا خیر جیش المہلب (یاقوت الحموی ، معجم البلدان ، بیروت : ۱۹۵۵ء ج ۱ ص ۵۰۱ ۔

(بنہ کے آثار قدیمہ موجودہ بنوں سے بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر دریافت ہوتے ہیں ۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ آثار قدیمہ کی ایک ٹیم نے وہاں حال ہی میں کھدائی کی ہے) ۔

۳۰ ۔ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ص ۴۳۹ ۔

۳۱ / ۔الف ۔ شمس الدین ذہبی ، سیر اعلام النبلاء ، بیروت : ۱۹۸۹ء ، ج ۴ ، ص ۴۴۳ ۔

۳۲ / ب ۔ علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۹۱ ۔

۳۳ ۔ایضاً ، ص ۹۲ ۔

۳۴ ۔ایضاً ، ص ۹۳ ۔

۳۵ ۔ فتحنامہ سندھ ، حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ، ص ۳۶ ۔

۳۶ ۔علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۵۰ ۔

۳۷ ۔ایضاً ، ص ۱۰۳ ۔

۳۸ ۔ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۴ ، ص ۳۹۱ ۔

۳۹ ۔ سستی قسم کی کتابوں میں سیستان کے اس حکمران کا نام رتبیل لکھا ہوتا ہے ۔ ولہاؤزن اور فلپ حتی نے زنبیل (Zunbil) لکھا ہے :

i - Hitti, P.K. History of the Arabs , London : 1964, P 231-

ii - Wellhausen, J: Arab Kingdom And Its Fall , Calcutta : 1927, P 231-

iii ۔ مسعودی نے مروج الذھب میں زنبیل ہی لکھا ہے ۔(مروج الذھب ، پیرس : ۱۸۶۳ء ، ج ۲ ، ص ۸۷) ۔

۴۰ ۔نور احمد خان فریدی ، پیر عبدالرحمن الہاشمی ، جھنگ : ۱۹۹۰ء ، ص ۹۱ - ۸۹ ۔

۴۱ ۔علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۹۴ ۔

۴۲ ۔ایضاً ، ص ۶۵ ۔

۴۳ ۔میر محمد معصوم بھکری ، تاریخ معصومی (مرتبہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ) ، بمبئی : ۱۹۳۸ء ، ص ۶ ۔

۴۴ ۔علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۹۵ ۔

۴۵ ۔ایضاً ، ص ۹۹ ۔

۴۶ ۔بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۱۲ ۔

۴۷ ۔میر محمد معصوم بھکری ، کتاب مذکور ، تعلیقہ ص ۲۶۲ ۔

۴۸ ۔بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۱۲ ۔

۴۹ ۔علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۹۹ ۔

۵۰ ۔قاضی اطہر مبارکپوری ، خلافت امویہ اور ہندوستان ، ص ۱۰۲ ۔

۵۱ ۔ابن حزم اندلسی ، جمہرۃ الانساب العرب ، دارالمعارف مصر (تاریخ اشاعت ندارد) ، ص ۲۷۸ ۔
(ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے بھی فتحنامہ سندھ کے ایک تعلیقے میں یہی شجرہ نقل کیا ہے) ۔
ملاحظہ ہو تعلیقات فتحنامہ سندھ ، ص ۵۹ ۔

۵۲ ۔ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۴ ، ص ۵۳۷ ۔

۵۳ ۔علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۷۱ ۔

۵۴ ۔ ایضاً ، ص ۷۱ ۔
۵۵ ۔ ایضاً ، ص ۷۲ ۔
۵۶ ۔ ایضاً ، تعلیقہ ، ص ۶۵ ۔
۵۷ ۔ ایضاً ، ص ۷۳ ۔
۵۸ ۔ ایضاً ۔
۵۹ ۔ ایضاً ، ص ۷۳ ۔
۶۰ ۔ ایضاً ۔
۶۱ ۔ عبدالقدوس ہاشمی ، تقویم تاریخی ، اسلام آباد : ۱۹۸۷ء ، ص ۲۴ ۔
۶۲ ۔ ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۴ ، ص ۵۳۷ ۔
۶۳ ۔ علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۷۶ ۔
۶۴ ۔ ایضاً ، ص ۷۷ ۔ ۷۶ ۔
۶۵ ۔ ایضاً ، ص ۷۷ ۔
۶۶ ۔ ایضاً ، ص ۷۸ ۔
۶۷ ۔ ایضاً ۔
۶۸ ۔ ایضاً ۔
۶۹ ۔ یعقوبی ، تاریخ یعقوبی ، دار صادر بیروت (تاریخ اشاعت ندارد) ، ج ۲ ، ص ۲۸۸ ۔
۷۰ ۔ علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۷۹ ۔
۷۱ ۔ ایضاً ، ص ۸۰ ۔
۷۲ ۔ ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۴ ، ص ۵۳۷ ۔
۷۳ ۔ علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۸۵ ۔
۷۴ ۔ ایضاً ، تعلیقہ از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ، ص ۷۵ ۔
۷۵ ۔ ایضاً ، ص ۸۲ ۔
۷۶ ۔ ایضاً ، ص ۸۳ ۔
۷۷ ۔ ایضاً ، ص ۸۷ ۔
۷۸ ۔ ایضاً ۔
۷۹ ۔ ایضاً ، ص ۸۸ ۔
۸۰ ۔ ایضاً ، تعلیقہ از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ، ص ۷۸ ۔
۸۱ ۔ ایضاً ، تعلیقہ ص ۷۹ ۔
۸۲ ۔ ایضاً ، ص ۹۰ ۔
۸۳ ۔ ایضاً ۔
۸۴ ۔ ایضاً ، ص ۹۱ ۔
۸۵ ۔ ایضاً ، ص ۹۲ ۔
۸۶ ۔ ایضاً ، ص ۹۷ ۔
۸۷ ۔ میر محمد معصوم بھکری ، کتاب مذکور ، تعلیقہ از ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، ص ۲۶۴ ۔
۸۸ ۔ علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۱۱۷ ۔

۸۹ - ایضاً، ص ۱۳۱ -
۹۰ - ایضاً، ص ۱۳۸ -
۹۱ - ایضاً -
۹۲ - میر محمد معصوم بھکری، کتاب مذکور، ص ۲۶ -
۹۳ - ایضاً، ص ۲۸ -
۹۴ - علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۱۴۷ -
۹۵ - ایضاً -
۹۶ - ایضاً، تعلیقہ از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۱۱۳ -
۹۷ - ایضاً -
۹۸ - Mahdi Hasan, The Rise And Fall of Muhammad Bin Tughluq, London : 1938, P 186.
۹۹ - علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۱۵۱ -
۱۰۰ - ایضاً، ص ۱۵۲ -
۱۰۱ - ایضاً، ص ۱۵۳ -
۱۰۲ - ایضاً، ص ۱۵۵ -
۱۰۳ - ایضاً -
۱۰۴ - ایضاً، ص ۱۶۰ -
۱۰۵ - ایضاً، ص ۱۸۱ -
۱۰۶ - ایضاً، ص ۱۸۲ -
۱۰۷ - بلاذری کتاب مذکور، ص ۶۱۷ -
۱۰۸ - ابن اثیر، کتاب مذکور، ج ۴، ص ۵۳۹ -
۱۰۹ - علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۱۸۵ -
۱۱۰ - قاضی اطہر مبارکپوری، خلافت امویہ اور ہندوستان، ص ۱۲۱ -
۱۱۱ - علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۱۸۵ -
۱۱۲ - ابن جریر طبری، تاریخ الرسل و الملوک، بریل : ۱۸۸۳ء، ص ۱۲۹۸ -
۱۱۳ - ابی حنیفہ دنیوری، کتاب الاخبار الطوال، بریل : ۱۸۸۸ء، ص ۳۳۱ -
۱۱۴ - ابن جریر طبری، تاریخ الرسل و الملوک، بریل : ۱۸۸۳ء، ص ۱۲۸۲ -
۱۱۵ - ابن اثیر، کتاب مذکور، ج ۴، ص ۵۸۸ -
۱۱۶ - میر محمد معصوم بھکری، کتاب مذکور، ص ۳۰ -
۱۱۷ - ایضاً، ص ۳۱ -
۱۱۸ - علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۱۴۰ -
۱۱۹ - بلاذری، کتاب مذکور، ص ۶۱۸ -
۱۲۰ - ابن اثیر، کتاب مذکور، ج ۴، ص ۵۸۹ -

حواشی

محمد بن قاسم کے جانشین

۱- Muhammad Ishaq , India.s Contribution to the Study of Hadith Literature, Dacca: 1955, P 24
۲- بلاذری ، فتوح البلدان ، بیروت : ۱۹۵۷ء ، ص ۶۱۹ ۔
۳- اطہر مبارکپوری ، خلافت امویہ اور ہندوستان ، دہلی : ۱۹۵۷ء ، ص ۱۲۳ ۔
۴- اطہر مبارکپوری ، الرجال السند و الہند ، قاہرہ : ۱۳۹۸ھ ، ص ۲۷۰ ۔
۵- سید ابو ظفر ندوی ، تاریخ سندھ ، اعظم گڑھ : ۱۹۴۷ء ، ص ۱۲۴ ۔
۶- ابن اثیر ، الکامل فی التاریخ ، بیروت : ۱۹۶۸ء ج ۱ ، ص
۷- اطہر مبارکپوری ، رجال السندو الہند ، ص ۲۹۴ ۔
۸- ایضاً ، ص ۲۷۷ ۔
۹- سید ابوظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۲۵ ۔
۱۰- اطہر مبارکپوری ، خلافت امویہ اور ہندوستان ، ص ۱۷۷ ۔
۱۱- اطہر مبارکپوری ، رجال السندو الہند ، ص ۲۳۶ ۔
۱۲- ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ص ۵۹۰ ۔
۱۳- یعقوبی ، تاریخ الیعقوبی ، بیروت : ۱۹۶۰ء ، ج ۲ ، ص ۳۱۷ ۔
۱۴- ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ص ۵۹۰ ۔
۱۵- بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۲۳ ۔
۱۶- یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۳۳ ۔
۱۷- ایضاً ، ص ۳۲۰ ۔
۱۸- ایضاً ۔
۱۹- ایضاً ۔
۲۰- ایضاً ، ص ۳۵۸ ۔
۲۱- ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۴۷ ۔
۲۲- یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۷۲ ۔
۲۳- ایضاً ، ص ۳۷۳ ۔
۲۴- ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۵۳ ۔
۲۵- یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۷۳ ۔
۲۶- ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۵۶ ۔

۲۷ - بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۲۴ -
۲۸ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۲۷۳ -
۲۹ - ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۶ ، ص ۴۱ -
۳۰ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۹۸ -
۳۱ - ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۶ ، ص ۶۴ -
۳۲ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۹۸ -
۳۳ - ایضاً -
۳۴ - ایضاً -
۳۵ - ایضاً -
۳۶ - محمد معصوم بھکری ، تاریخ معصومی ، بمبئی : ۱۹۳۸ء تعلیقہ از ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، ص ۲۶۸ -
۳۷ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۹۸ -
۳۸ - ایضاً ، ص ۴۰۹ -
۳۹ - ایضاً -
۴۰ - ایضاً -
۴۱ - ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۹۶ -
۴۲ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۴۰۹ -
۴۳ - ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، کتاب مذکور ، ص ۲۶۸ -
۴۴ - ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۹۷ -
۴۵ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۴۰۹ -
۴۶ - ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، کتاب مذکور ، ص ۲۶۸ -
۴۷ - ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۹۷ -
۴۸ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۴۰۹ -
۴۹ - اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الہند ، ص ۳۹۳ -
۵۰ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۴۰۹ -
۵۱ - ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۹۹ -
۵۲ - ابن ابی اصیبعہ ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء ، المطبع الوھبیہ مصر : ۱۲۹۹ھ ، ج ۲ ، ص ۳۲ - ۳۳ -
۵۳ - ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، حوالہ مذکور ، ص ۲۶۸ -
۵۴ - ابو ظفر ندوی ، کتاب مذکور ، ص ۱۷۲ -
۵۵ - ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۶ ، ص ۴۰۹ -
۵۶ - ایضاً ، ص ۴۰۹ -
۵۷ - بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۲۹ -
۵۸ - اطہر مبارکپوری ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، دہلی : ۱۹۶۷ء ، ص ۴۱ -
۵۹ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۴۵۸ -
۶۰ - ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، کتاب مذکور ، ص ۲۶۸ -
۶۱ - یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۴۷۹ -

۶۲ ۔ ایضاً ، ص ۳۸۶ ۔
۶۳ ۔ بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۱۳ ۔
۶۴ ۔ Hitti, P.K., History of the Arabs, London: 1964, P 461.
۶۵ ۔ یعقوبی ، کتاب مذکور ، ص ۳۹۰ ۔
۶۶ ۔ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ، کتاب مذکور ، ص ۲۹۹ ۔
۶۷ ۔ اطہر مبارکپوری ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، ص ۳۲ ۔
۶۸ ۔ بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۲۴ ۔

حواشی

خود مختار حکومتوں کا قیام

۱ - بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۲۶ -
۲ - اصطخری ، المسالک والممالک ، قاہرہ : ۱۹۶۱ء ، ص ۱۰۲ -
۳ - ابن حوقل ، صورۃ الارض ، دارمکتبہ الحیاۃ بیروت ، ص ۲۷۹ -
۴ - مسعودی ، مروج الذھب ، پیرس : ۱۸۶۳ء ، ج ۲ ، ص ۸۵ -
۵ - بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۲۶۲ -
۶ - ایضاً -
۷ - ایضاً -
۸ - یعقوبی ، تاریخ یعقوبی ، دار صادر بیروت (تاریخ اشاعت ندارد) ، ج ۲ ، ص ۳۹۰ -
۹ - مسعودی ، کتاب مذکور ، ج ۱ ، ص ۳۷۷ -
۱۰ - مقدسی ، احسن التقاسیم ، مکتبہ خیاط بیروت ، ص ۴۸۹ -
۱۱ - مسعودی ، کتاب مذکور ، ج ۱ ، ص ۳۷۶ -
۱۲ - اصطخری ، کتاب مذکور ، ص ۱۰۴ -
۱۳ - مقدسی ، احسن التقاسیم ، مکتبہ خیاط بیروت ، ص ۴۸۱ -
۱۴ - Muhammad Nazim, The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna, Lahore : 1973, P 99.
۱۵ - اصطخری ، کتاب مذکور ، ص ۱۰۵ -
۱۶ - ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ۹ ، ص ۳۱۲ -
۱۷ - ابن خلدون ، کتاب العبر ، بیروت : ۱۹۵۸ء ، ج ۴ ، ص ۸۱۲ -
۱۸ - ابن ابی اصیبعہ ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء ، المطبعۃ الوھبیہ ۱۲۹۹ھ ، ج ۲ ، ص ۱۰۴ -
۱۹ - اصطخری ، کتاب مذکور ، ص ۱۰۵ -

حواشی

نظام حکومت

۱ ۔ قرآن حکیم ، سورۃ النساء : ۸۰ ۔
۲ ۔ i ۔ الماوردی ، الاحکام السلطانیہ ، مطبعۃ الاتحاد المصری قاہرہ (تاریخ ندارد) ، ص ۳ ۔
ii ۔ ابو یعلیٰ ، الاحکام السلطانیہ ، قاہرہ ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۹ ۔
۳ ۔ فضل اللہ بن روز بہان ، سلوک الملوک ، حیدر آباد : ۱۹۶۶ء ص ۴۱ ۔
۴ ۔ Husaini , Dr.S.A.Q : Arab Administration , Lahore : 1961, P 119.
۵ ۔ ابن بطوطہ ، عجائب الاسفار ، اسلام آباد ، ۱۹۸۳ء ، ص ۱۰ ۔
۶ ۔ الماوردی ، کتاب مذکور ، ص ۲۵ ۔ ۲۳ ۔
۷ ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، لاہور : ۱۹۷۳ء ، ج ۱۲ ، ص ۱۰۷ ۔
۸ ۔ Husaini . op . cit . p 120
۹ ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، ج ۱۲ ، ص ۲۰۷ ۔
۱۰ ۔ قرآن مجید ، سورۃ طٰہٰ ، آیت ۲۹ ۔
۱۱ ۔ الماوردی ، کتاب مذکور ، ص ۱۸ ۔
۱۲ ۔ علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۱۵۱ ۔
۱۳ ۔ الماوردی ، کتاب مذکور ، ص ۱۷۹ ۔
۱۴ ۔ ایضاً ، ص ۵۳ ۔
۱۵ ۔ فضل اللہ بن روز بہان ، کتاب مذکور ، ص ۱۰۰ ۔
۱۶ ۔ ایضاً ، ص ۱۲۷ ۔ ۱۲۹ ۔
۱۷ ۔ الماوردی ، کتاب مذکور ، ص ۵۹ ۔
۱۸ ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی ، کراچی : ۱۹۸۱ء ص ۹۹
۱۹ ۔ Husaini, op . cit . p 119.
۲۰ ۔ Husaini, op. cit . p 120.
۲۱ ۔ فضل اللہ بن روز بہان ، کتاب مذکور ، ص ۳۵۰ ۔
۲۲ ۔ Husaini, op . cit . P 127.
۲۳ ۔ فضل اللہ بن روز بہان ، کتاب مذکور ، ص ۳۲۲ ۔
۲۴ ۔ الماوردی ، کتاب مذکور ، ص ۱۸۷ ۔
۲۵ ۔ Husaini, op . cit, P 141.

۲۶ - ابن جوزی ، مناقب عمر بن عبدالعزیز ، لپزگ : ۱۸۹۹ء ، ص ۵۱ -
۲۷ - ابن اثیر ، الکامل فی التاریخ ، بیروت : ۱۹۶۵ء ، ج ۳ ، ص ۵۸۹ -
۲۸ - بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۶۱۴ -
۲۹ - علی بن حامد کوفی ، کتاب مذکور ، ص ۷۷ -
۳۰ - ایضاً ، ص ۱۱۳ -
۳۱ - Husaini, S.A.Q. op. cit. P 97
۳۲ - الماوردی ، کتاب مذکور ، ص ۱۳۹ -
۳۳ - ایضاً ، ص ۱۴۰ -
۳۴ - یہ سکے راقم کے ذاتی ذخیرہ مسکوکات میں محفوظ ہیں -
۳۵ - ابن حوقل ، صورۃ الارض ، مکتبہ الحیاۃ بیروت (تاریخ ندارد) ص ۲۷۷ -
۳۶ - مقدسی ، احسن التقاسیم ، بیروت : ۱۹۰۶ء ص ۴۸۲ -
۳۷ - اصطخری ، المسالک و الممالک ، قاہرہ : ۱۹۶۱ء ص ۱۰۳ -
۳۸ - یعقوبی ، کتاب الیعقوبی ، بیروت : ۱۹۶۰ء ، ج ۲ ، ص ۳۱۷ -

حواشی

تہذیبی اثرات

۱ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، خلافت امویہ اور ہندوستان ، ص ۲۸ ۔
۲ ۔ میر محمد معصوم بھکری ، کتاب مذکور ، ص ۲۸ ۔
۳ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، کتاب مذکور ، ص ۳۴۸ ۔
۴ ۔ مسعودی ، کتاب مذکور ، ج ۲ ، ص ۸۶ ۔
۵ ۔ ابن حوقل ، کتاب مذکور ، ص ۲۸۰ ۔
۶ ۔ مقدسی ، کتاب مذکور ، ص ۴۸۲ ۔
۷ ۔ ایضاً ، ص ۴۸۱ ۔
۸ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، کتاب مذکور ، ص ۳۰۲ ۔
۹ ۔ مقدسی ، کتاب مذکور ، ص ۴۸۱ ۔
۱۰ ۔ زکریا قزوینی ، آثار البلاد و اخبار العباد ، بیروت : ۱۹۶۰ء ، ص ۱۲۲ ۔
۱۱ ۔ ابوالفرج اصفہانی ، کتاب الاغانی ، مطبوعہ شرکتہ مساہمہ مصریہ ، (تاریخ اشاعت ندارد) ، ص ۱۴۷ ۔
۱۲ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، کتاب مذکور ، ص ۴۰۱ ۔
۱۳ ۔ ابن حوقل ، کتاب مذکور ، ص ۲۸۰ ۔
۱۴ ۔ عبدالرحمن ابن ابی حاتم الرازی ، کتاب الجرح والتعدیل ، حیدرآباد : ۱۹۵۲ء ، ص ۱۴۰ ۔
۱۵ ۔ بلاذری ، فتوح البلدان (اردو ترجمہ) کراچی ۱۹۶۲ء ، ص ۶۱۷ ۔
۱۶ ۔ بلاذری ، کتاب مذکور (عربی) ، ص ۶۰۸ ۔
۱۷ ۔ مسعودی ، مروج الذہب ، پیرس : ۱۸۷۱ء ، ج ۹ ، ص ۱۳ ۔
۱۸ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، کتاب مذکور ، ص ۳۰۳ ۔
۱۹ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الہند ، قاہرہ : ۱۳۹۸ھ ، ص ۱۳۲ ۔
۲۰ ۔ ایضاً ، ص ۱۰۱ ۔
۲۱ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، خلافت امویہ اور ہندوستان ، ص ۶۶۰ ۔
۲۲ ۔ بلاذری ، کتاب مذکور ، ص ۲۲۹ ۔
۲۳ ۔ مقدسی ، کتاب مذکور ، ص ۴۸۰ ۔
۲۴ ۔ ایضاً ، ص ۴۷۷ ۔
۲۵ ۔ ابن ابی اصیبعہ ، کتاب مذکور ، ج ، ص ۳۳ ۔
۲۶ ۔ خورشید احمد فارق ، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان ، دہلی : ۱۹۷۳ء ، ص ۳۲۵ ۔
۲۷ ۔ ایضاً ، ص ۳۲۹ ۔

۲۸ ۔ ابنِ ابی اصیبعہ ، کتاب مذکور ، ج ۲ ، ص ۳۲ ۔
۲۹ ۔ ایضاً ، ج ۲ ، ص ۳۲ ۔
۳۰ ۔ خورشید احمد فارق ، کتاب مذکور ، ص ۳۳۲ ۔
۳۱ ۔ ابن ابی اصیبعہ ، کتاب مذکور ، ج ۲ ، ص ۳۴ ۔
۳۲ ۔ خورشید احمد فارق ، کتاب مذکور ، ص ۳۳۲ ۔

حواشی

عربوں کے عہد میں علم و ادب

۱- Muhammad Ishaq, India's Contribution to the Study of Hadith Literature, Dacca: 1955, p 24.

۲- اطہر مبارکپوری، رجال السندو الهند، قاہرہ: ۱۳۹۸ھ، ص ۳۵۸۔

۳- عبدالحی لکھنوی، نزہتہ الخواطر، حیدر آباد: ۱۹۴۷ء، ج ۱، ص ۲۳۔

۴- محمد اسحق، کتاب مذکور، ص ۲۶۔

۵- علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۹۔

۶- ابن اثیر، کتاب مذکور، ج ۵، ص ۸۷-۸۹۔

۷- قاضی اطہر مبارکپوری، رجال السند و الهند، ص ۳۰۳۔

۸- ثقہ فن حدیث کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی "بڑے قابل اعتماد" کے ہیں۔

۹- محمد اسحق، کتاب مذکور، ص ۲۶۔

۱۰- ابن اثیر، کتاب مذکور، ج ۹، ص ۳۶۔

۱۱- رحمن علی، تذکرہ علمائے ہند، لکھنو: ۱۸۹۴ء، ص ۳۔

۱۲- قاضی اطہر مبارکپوری، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، دہلی: ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۷۔

۱۳- خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، حیدر آباد: ۱۹۳۱ء، ج ۱۳، ص ۳۲۷۔

۱۴- سمعانی، کتاب الانساب، لندن: ۱۹۱۲ء، ص ۳۱۳ ب۔

۱۵- اطہر مبارکپوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص ۱۵۶۔

۱۶- ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد: ۱۹۵۶ء، ج ۲، ص ۶۸۹۔

۱۷- ایضاً، ج ۲، ص ۶۵۔

۱۸- ابی تمام حبیب، دیوان الحماسۃ، لاہور: ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۔

۱۹- رٹر، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور: ۱۹۶۴ء، ج ۱، ص ۹۳۳۔

۲۰- اطہر مبارکپوری، رجال السند و الهند، ص ۲۸۳۔

۲۱- یاقوت الحموی، معجم البلدان، بیروت: ۱۹۶۵ء، ج ۲، ص ۳۹۵۔

۲۲- قاضی اطہر مبارکپوری، رجال السند و الهند، ص ۹۳۔

۲۳- ایضاً، ص ۱۹۲۔

۲۴- خطیب بغدادی، کتاب مذکور، ج ۸، ص ۳۳۳۔

۲۵- ابن جوزی، صفتہ الصفوٰۃ، حیدر آباد، ۱۳۵۶ھ، ج ۴، ص ۵۳-۵۲۔

۲۶- قاضی اطہر مبارکپوری، رجال السند و الهند، ص ۶۵۔

٢٧ ۔ یاقوت الحموی ، کتاب مذکور ، ج ١ ، ص ٢٥٨ ۔
٢٨ ۔ ڈاکٹر محمد اسحق ، کتاب مذکور ، ص ٣٦ ۔
٢٩ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، ص ١٩١ ۔
٣٠ ۔ سمعانی ، کتاب الانساب ، لائڈن : ١٩١٢ء ، ص ٢٣٦ ب ۔
٣١ ۔ یاقوت الحموی ، کتاب مذکور ، ج ٢ ، ص ٣٩٥ ۔
٣٢ ۔ سمعانی ، کتاب مذکور ، ص ٢٣٦ ب ۔
٣٣ ۔ قاضی اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الهند ، ص ٢٨٦ ۔
٣٤ ۔ سمعانی ، کتاب مذکور ، ص ٢٣٦ ب ۔
٣٥ ۔ اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الهند ، ص ١٠٥ ۔
٣٦ ۔ اطہر مبارکپوری ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، ص ١٩٢ ۔
٣٧ ۔ ایضاً ، ص ١٩٣ ۔
٣٨ ۔ ایضاً ، ص ١٩١ ۔
٣٩ ۔ بزمی انصاری ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، لاہور : ١٩٧٢ء ، ج ٩ ، ص ٥٢٢ ۔
٤٠ ۔ i ۔ طبری ، کتاب مذکور ، ص ٢١٣٩ ۔
ii ۔ ابن اثیر ، کتاب مذکور ، ج ٧ ، ص ٣٦٥ ۔
٤١ ۔ یاقوت الحموی ، کتاب مذکور ، ج ٨ ، ص ١٧٧ ۔
٤٢ ۔ مقدسی ، کتاب مذکور ، ص ٤٨٩ ۔
٤٣ ۔ ابن حوقل ، کتاب مذکور ، ص ٢٧٧ ۔
٤٤ ۔ اصطخری ، کتاب مذکور ، ص ١٠٣ ۔
٤٥ ۔ ابن الفقیہ الهمذانی ، کتاب البلدان ، لائڈن : ١٨٨٥ء ، ص ٢٥١ ۔
٤٦ ۔ سمعانی ، کتاب مذکور ، ص ٥٤٣ ب ۔
٤٧ ۔ ایضاً ۔
٤٨ ۔ ابن ندیم ، الفہرست ، مطبوعہ المطبعۃ الرحمانیہ مصر (تاریخ اشاعت ندارد) ، ص ٣٠٦ ۔
٤٩ ۔ سمعانی ، کتاب مذکور ، ص ٥٤٣ ب ۔
٥٠ ۔ مقدسی ، کتاب مذکور ، ص ٤٨١ ۔
٥١ ۔ اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الهند ، ص ٣٦ ۔
٥٢ ۔ ابی القاسم حمزہ السہمی ، تاریخ جرجان ، حیدر آباد : ١٩٥٠ء ، ص ٨٥ ۔
٥٣ ۔ یاقوت الحموی ، کتاب مذکور ، ج ٢ ، ص ٣٠٧ ۔
٥٤ ۔ تاج الدین سبکی ، طبقات الشافعیہ الکبریٰ ، مطبع حسینیہ مصر (تاریخ اشاعت ندارد) ، ج ٣ ، ص ٦٦ ۔
٥٥ ۔ اطہر مبارکپوری ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، ص ١٩٣ ۔
٥٦ ۔ ایضاً ۔
٥٧ ۔ ایضاً ۔
٥٨ ۔ اصطخری ، کتاب مذکور ، ص ١٠٥ ۔
٥٩ ۔ سمعانی ، کتاب مذکور ، ص ٣٥٥ ب ۔
٦٠ ۔ اطہر مبارکپوری ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، ص ٢٩٩ ۔

۶۱ ۔ علی اکبر دہخدا ۔ لغت نامہ دہخدا، تہران: ۱۳۳۴ھ ش ۔ ج ۲۵ ۔ ص ۱۹ ۔
۶۲ ۔ عوفی، لباب الالباب، تہران: ۱۳۳۳ھ ش، ص ۲۹۴ ۔
۶۳ ۔ علی بن حامد کوفی، کتاب مذکور، ص ۶ ۔
۶۴ ۔ ایضاً، ص ۷ ۔
۶۵ ۔ ابن حوقل، کتاب مذکور، ص ۲۸۰ ۔
۶۶ ۔ سید علی ہجویری، کشف المحجوب، تہران، ۱۳۳۶ق ش، ص ۱۷۹ ۔

پروفیسر محمد اسلم کے قلم سے

"وسطِ ایشیا کا شاندار ماضی"

وسطِ ایشیا، ایک مردم خیز خطہ ہے جہاں امام محمدؒ بن اسمٰعیل بخاریؒ اور امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ جیسے شہرۂ آفاق محدثین، امام ابو منصور ماتریدیؒ اور ابو حفص عمر النسفیؒ جیسے ائمۂ عقائد، حضرت برہان الدین مرغینانیؒ، امام صدر شہیدؒ شمس الائمہ سرخسیؒ، امام خواہرزادہ اور قاضی خان جیسے فقہا، شیخ الاسلام محمد بن اسمٰعیل الخطیب الاسفورقانی، علامہ شریف جرجانی، سعدالدین تفتازانی اور جاراللہ زمخشری جیسے علما، ابو زید بلخی اور ابوریحان البیرونی جیسے جغرافیہ دان، شیخ احمد یسوی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی، حضرت عبدالخالق غجدوانی، حضرت شمس الدین امیر کلال، شاہ بہاالدین نقشبند اور خواجہ ناصرالدین عبیداللہ احرار جیسے صوفیہ کرام، ظہیرالدین محمد بابر، الغ بیگ اور سلطان حسین بایقرا جیسے علم دوست حکمران، میر علی شیر نوائی اور فضل اللہ بن روزبہان جیسے فضلا، مولانا جلال الدین رومی اور نورالدین عبدالرحمٰن جامی جیسے شعرا پیدا ہوئے۔ اسلامی ہند کے اولین حکمران سلطان قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش اور سلطان غیاث الدین بلبن کا تعلق بھی اسی خطۂ پاک کے ساتھ تھا، وسطِ ایشیاء کی تہذیب و ثقافت اور علم و تصوف نے جس انداز سے برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی تہذیب و ثقافت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی، زیرِ نظر کتاب میں اس موضوع پر مورخِ شہیر پروفیسر محمد اسلم، سابق صدر شعبۂ تاریخ جامعۂ پنجاب نے قلم اٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی دوسری تصانیف کی طرح یہ تصنیف بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

میا... [illegible]